Ahsanul-Intikhab

SELECTED AND EDITED

by

MOULVI HAFIZ SHAH ALI AHSAN,
"Ahsan," Marehravi,
Urdu Lecturer, Muslim University, Aligarh.

احسن الانتخاب

PUBLISHED BY :-

Educational Book House,

CIVIL LINES, ALIGARH.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

تعارف

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے سال رواں سے اُردو کو بھی اختیاری مضامین میں شامل کردیا ہے جس کے لئے میر تقی میر، مرزا غالب اور مولانا حالی کا منتخب اور مفید کلام، احسن الانتخاب کے نام سے شائع کیا جاتا ہے۔ انتخابی نظموں کے علاوہ نثر میں سنہ ۱۲۶۱ ہجری کا وہ یادگار مشاعرہ جو ابوظفر بہادر شاہ آخری تاجدار دہلی کے عہد میں باہتمام مولوی کریم الدین صاحب ہوا تھا اور جس کو مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی نے نہایت قابلیت کے ساتھ اپنی مقبول طرز نگارش میں قلم بند کیا ہے اس انتخاب میں داخل

اُردیا گیا ہی جس کے مطالعے سے اُس عہد کا مذاقِ شعروادب، اور قلعۂ معلّٰی کی بعض خصوصیاتِ معاشرت کا اندازہ اس طرح ہوتا ہی جس طرح چشم دید حالات و واقعات معلوم ہو سکتے ہیں۔

کارکنِ مشاعرہ کی شخصیت، شاہانہ مشاعرانہ کی اہلیت، ظلّ سبحانی تک رسائی، بادشاہ سلامت کا اندازِ تکلّم، قلعۂ معلّٰی کی سیر، شعرائے دہلی کو دعوتِ شرکت دینا، ہر ایک کے مکان پر جانا، ہر شاعر کی طرزِ زندگی و خصائل و عادات کا معلوم ہونا، آپس کی نوک جھوک، شعرا کی آمد کا منظر، مشاعرے کی ابتدا، شعرا کا اندازِ بیان، اور نمونۂ کلام، تنقید و تبصرہ، **طریق نشست** وغیرہ ایسے دل کش پیرائے میں تحریر ہیں کہ بالکل یہ معلوم ہوتا ہی جیسے تمام واقعات اپنے سامنے ہو رہے ہیں اور بچشم خود اس مشاعرہ کو دیکھ کر حال و قال سے دَورِ ماضی کے لطف اُٹھا رہے ہیں جس میں کلام **شاہ و شاہزادگانِ** والا تبار، اور شاعرانِ دربار و یکتائے روزگار کی خصوصیتیں قابلِ دید و لائقِ داد ہیں۔ دل چسپی کے علاوہ طلبہ کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا اور طلبہ کے اخلاق پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔

احسن الانتخاب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نصاب تعلیم میں شامل ہی اور یہی نصاب **جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن** میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس انتخابی ترتیب میں طلبہ کی واقفیت بڑھانے کے لئے بعض مفید باتوں کا اضافہ کیا گیا ہی۔ مثلاً :۔

(۱) تمام مشکل الفاظ، محاورات اور تلمیحات وغیرہ کے معنی اور ضروری تشریحات و تفاصیل، حواشی کے تحت میں کر دی گئی ہیں۔

(۲) جن نامور شعرا کا کلام اس انتخاب میں لیا گیا ہے اُن کے ایسے مختصر حالات، تبصرۂ کلام کے ساتھ درج کر دیئے ہیں جن سے طلبہ کی معلومات میں مفید اضافہ ہو اور اہل قلم کے حالات زندگی کی واقفیت کے ساتھ ان کی خصوصیات سے بھی بے خبر نہ رہیں۔

(۳) نصاب (Syllabus) میں **عروض، بیان اور بدیع** سے معمولی واقفیت حاصل کرنے کو ضروری بتایا گیا ہے، اس ہدایت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ التزام کیا گیا ہے کہ تمام غزلوں اور نظموں کے عنوانات میں ہر غزل اور نظم کا وزنِ عروضی لکھ دیا ہے، اس سے کم از کم یہ فائدہ ہوگا کہ طلبہ اکثر عروض کی بحروں اور وزنوں سے آشنا ہو جائیں گے۔

(۴) سہولت و آسانی کے غرض سے اس انتخاب میں یہ ترتیب قائم کی گئی ہے کہ حسب ردیف میں جتنی غزلیں اور نظمیں ایک ہی وزن میں ہیں اُن کو ایک سلسلے میں درج کیا گیا ہے اور جب دوسرا وزن شروع ہوا ہے تو اُس کو بعد کے سلسلے میں رکھا گیا ہے۔

(۵) عروض کی بحروں کے نام تو اصل عربی ہی میں رہنے دیے ہیں، مگر اُن کے ارکان کی تعداد (مثلاً مسدّس، مثمّن وغیرہ) یا زحافات کے نام (مثلاً

اخرم، اثلم، مکفوف، مخبون وغیرہ) کو خارج کر کے، مسدّس و مثمّن کی جگہ
(۶ رُکنی، ۸ رُکنی وغیرہ) اور زحافات کے عوض نمبر ا و ۲، وغیرہ
مقرر کر دیے ہیں۔

(۶) حواشی کے آخر میں عروض کے متعلق ایسی مختصر اور مفید تفصیل کر دی گئی
ہے جس سے عروض کے ابتدائی اصول طلبہ کو معلوم ہو جائیں۔

(۷) حواشی کے سلسلے میں مناسب مواقع پر شاعرانہ صنائع، بدائع اور بیان
کے متعلق بھی فوائد و معلومات کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

غرض اس ترتیب سے تنہا یہی سہولت اور فائدہ مدِ نظر نہیں کہ موجودہ انتخاب
یکجا نظر آجائے بلکہ مقررّہ نصاب کے مطابق اس مجموعے سے معانی و بیان،
اور عروض و بدیع کی ضروری واقفیت بھی حاصل ہو جائے۔

اس نصاب میں جو ترتیب مندرج ہے اُس میں دیوان حالی کے انتخاب کا
نمبر (۱)، اور مرزا غالب کی غزلیات کا نمبر (۲) اور انتخاب کلام میر کا
نمبر (۳) ہے، لیکن اس انتخابِ یکجائی میں مصنفین مذکور کے عہد کا لحاظ
رکھتے ہوئے میر نمبر (۱)، غالب نمبر (۲) اور حالی کا کلام نمبر (۳) میں
لکھا گیا ہے۔ اسی طرح غزلوں کا اندراج عروض کی وزنی مطابقت اور
ردیف کی حرفی ترتیب کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔

أحسن الانتخاب کی تالیف و ترتیب میں حتی الامکان

اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ جدید کورس ہر حیثیت سے طلبہ کے لئے مفید و کار آمد ثابت ہو۔ اُمید ہے کہ یہ ناچیز کوشش طلبہ کے لئے مفید ثابت ہوگی اور معنوی حیثیت سے یہ انتخاب **احسن الانتخاب** سمجھا جائے گا۔ اور یقین ہے کہ دوسری یونیورسٹیاں بھی احسن الانتخاب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گی اور مؤلف کو شکریہ مزید کا موقع مرحمت فرمائیں گی۔

احسن الانتخاب کے مقبول عام بنانے میں مؤلف نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اس کا فرض منصبی یہی تھا کہ اعلیٰ مضامین سے احسن الانتخاب کے صفحات کو آراستہ کرکے سررشتۂ تعلیم کے سامنے پیش کردے اب اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھنا اور شرف قبولیت عطا فرمانا سررشتۂ تعلیم کا فرض ہے۔

راقم

احسن مارہروی

اُردو لیکچرار

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ


مسلم یونیورسٹی علی گڑھ



فہرستِ مضامین

(احسن الانتخاب)

حالاتِ میرؔ

ولادت ۱۱۳۶ھ / ۱۷۲۲ء — **وفات** ۱۲۲۵ھ / ۱۸۰۸ء

ولادت و خاندان

محمد تقی نام، میرؔ تخلص۔ باپ کے نام میں اہلِ تذکرہ اختلاف رکھتے ہیں، کوئی عبداللہ بتاتا، کسی نے علی متقی لکھا ہے، کہیں محمد علی پایا جاتا ہی۔ ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۲ء ہجری میں بمقام اکبر آباد (آگرہ) پیدا ہوئے۔ سالِ ولادت میں بھی تذکرہ نویسوں نے اختلاف کیا ہی۔ اس وقت تک اُن کی ولادت کا سنہ ۱۱۲۵ھ اکثر کتابوں میں مندرج ہو رہا ہی۔ مگر ڈاکٹر سر شاہ سلیمان چیف جسٹس الہ آباد نے مثنویاتِ میرؔ کے مقدمے میں ثابت کیا ہی کہ وہ ۱۱۳۶ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور یہ تحقیق قرینِ قیاس ہی۔

بقول میرؔ اُن کے بزرگ مع اپنے قبیلے کے حجاز (عرب) سے آکر سب سے پہلے دکن میں وارد ہوئے۔ وہاں سے احمد آباد گجرات میں مقیم ہوئے، ان کے پردادا احمد آباد گجرات سے اکبر آباد آئے اور یہیں اُن کا انتقال ہوا، میرؔ کے دادا اکبر آباد میں فوج دار مقرر ہوئے اور پچاس سال کی عمر میں انتقال کیا، اُن کے دو بیٹے تھے، بڑے کو خللِ دماغ تھا، اُس کا جوانی ہی میں انتقال ہو گیا۔ چھوٹے بیٹے میرؔ کے والد تھے،

دہلی کی آمد میر تقی دس گیارہ سال ہی کے تھے کہ اُن کے باپ نے اکبر آباد میں انتقال کیا، اور یہ خانگی پریشانیوں کی وجہ سے ابتدائے عمری میں دہلی چلے آئے۔ سراج الدین علی خاں آرزوؔ میر کے سوتیلے بھائی کے ماموں تھے اسی نسبت سے وہ اُن کے ساتھ رہنے لگے، یہ زمانہ احمد شاہ بادشاہ دہلی کا تھا۔

تعلیم و تربیت دلّی ہی میں پرورش اور تعلیم پائی، فارسی ادب میں کمال حاصل کیا، لیکن اس کا پتا نہیں چلتا کہ عربی کی استعداد کس قدر تھی خانِ آرزوؔ کے شاگرد تھے "نکات الشعرا (تذکرہ شعرا مولفہ میر) میں میرؔ نے خانِ آرزو کو اپنا استاد و پیر و مرشد لکھا ہے۔

شہرت و عروج میر کا دہلی میں عرصہ دراز تک قیام رہا یہیں ان کی شاعری نے عروج پایا اور جوانی ہی میں اُن کو مسلّم الثبوت اُستاد کے درجے تک پہنچایا، چناں چہ وہ کہتے ہیں: ؎

کھول کر دیوان میرا دیکھ! قدرت مدعی
گرچہ ہوں میں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں

اس شعر میں قدرت کا اشارہ ایک ہم عصر شاعر (قدرت) کی طرف ہے۔

لکھنؤ میں آمد بارہویں صدی ہجری کا آخر حصّہ سلطنت مغلیہ پر مرہٹوں کی چڑھائی کا زمانہ تھا، یہی زمانہ شاہی دربار (دربار شاہ عالم) کے تنزل کا تھا، عام پریشانی کی وجہ سے شعر و سخن پر بہت بڑا اثر پڑا، اکثر سخنور شعرا نے دہلی کا قیام ترک کر دیا۔ آرزو۔ سوداؔ اور میر سوزؔ وغیرہ لکھنؤ چلے آئے، لیکن میرؔ عرصے تک دہلی ہی میں مقیم رہے، بالآخر ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۲ء (زمانہ نواب آصف الدولہ) میں میرؔ بھی دہلی سے

لکھنؤ چلے آئے اُس وقت اُن کی عمر ساٹھ سال کی کہی جاتی ہے۔

میر کی اُستادی

میر کی استادی دلّی ہی میں مسلّم ہو چکی تھی، خود خواجہ میر درد نے ان کو اپنے ہاں مشاعرہ کرنے اور میر مجلس بننے کی تحریک کی تھی، سودا اگرچہ عمر میں میر سے بڑے تھے اور ان کے بچپن ہی میں پورے شاعر ہو چکے تھے لیکن وہ غزل گوئی میں میر کو بھی اُستاد مانتے تھے، چناں چہ کہتے ہیں:

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہی تجھ کو میر سے اُستاد کی طرف

یہ بہت بڑا فخر میر کو خود اُن کی حیات ہی میں حاصل ہوا کہ سب اُن کو اُستاد ماننے لگے مسافر اُن کی غزلوں کو شہر بہ شہر تحفے کے طور پر لے جاتے تھے اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ میر اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ ممتاز تسلیم کئے جاتے تھے۔

میر کی وفات کے بعد سے اب تک کسی شاعر نے میر کی غزل گوئی میں اُستاد ہونے سے انکار نہیں کیا اور اپنے کلام کے متعلق میر کی پیشین گوئی ثابت ہوئی وہ کہتے ہیں:

بعد ہمارے اس فن کا جو کہ ماہر ہووے گا　　درد آگیں انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ روؤے گا
جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز　　تاحشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

وفات

میر کا انتقال بمقام لکھنؤ ۱۲۲۵ھ ۱۸۰۸ء ہجری میں ہوا، وہیں دفن ہوئے لیکن افسوس کہ باوجود اس شہرت کے اُن کی قبر پر نہ تو کوئی کتبہ نصب کیا گیا نہ کہیں قرار قائم رہا۔ اس لئے اس کا صحیح پتا نہیں کہ وہ کس جگہ دفن ہوئے۔ پندرہ بیس سال کا زمانہ ہوا کہ مرحوم حامد علی خاں بیرسٹرایٹ لا نے بعض پرانی روایتوں اور بوڑھوں کی بیان کردہ حکایتوں کی بنا پر آغا میر کی ڈیوڑھی میں اُن کا مزار ایک چبوترے پر بنوا دیا تھا جس کے

متعلق اب بھی اختلاف سُنا جاتا ہے۔ شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی نے اُن کے انتقال کی تاریخ یہ کہی ہے :۔

وا ویلا مُرد شہِ شاعراں

اس مصرع سے ۱۲۲۵ ہجری برآمد ہوتے ہیں جو ۱۸۰۸ء سے مطابق ہیں۔

تبصرۂ کلام

میر کے کلام کی خصوصیت اُن کی سادگی ہے۔ روزمرہ کے سہل اور آسان الفاظ میں حسن و خوبی کے ساتھ اظہارِ خیال کرنے میں اُن کو کمال حاصل ہے، سلاست زبان اور صفائی اُن کا خاص حصّہ ہے۔ اُن کے کلام کو اگر سہل ممتنع کہا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ مثلاً :۔

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا　　لہو آتا ہے جب نہیں آتا

یا۔ تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو　　رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

یا۔ ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا　　دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

چھوٹی بحروں میں غزلیات کہنے میں میر کا ہم پلہ کوئی شاعر اب تک نہیں ہوا۔ خاص خاص قافیوں اور بحروں میں جو اُن کی طبیعت کے مناسب تھے لاجواب اشعار اُن کے قلم سے نکلے ہیں۔

اگرچہ شستگی، پاکیزہ بیانی، سادگی اور تاثیر کلام کے اعتبار سے میر کا رتبہ سب سے اعلیٰ ہے لیکن فطرۃً وہ پژمردہ دل تھے، دردمند خیالات میں محو رہا کرتے تھے، خندگی یا بشاشت تو چھو بھی نہیں گئی تھی اس لئے ہمیشہ درد آمیز شعر نکلتے تھے، ہجر، غم اور درد کے تذکرے سے اُن کو دلبستگی تھی، ناکامیِ عشق ہی کا ذکر بار بار آتا تھا۔ عیش و نشاط یا وصل کا ذکر اُن کے کلام میں بہت کم ہے۔ درد انگیز اور مایوسانہ طرز سے

فی الواقع اُن کے مزاج کی ساخت کا پتا چلتا ہے، اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زندگی پریشانی میں بسر ہوئی تھی، کلام سے جو حسرت اور مایوسی ٹپکتی ہے، اس کی وجہ ان کی زندگی کے واقعات ہیں۔ عمر کا زیادہ حصّہ "یعنی ساٹھ سال" دلّی میں بسر ہوا۔ لیکن یہ زمانہ دلّی کی تباہی کا تھا، برابر ہر قسم کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، جس کے وہ کم سنی ہی سے باپ کے انتقال کی وجہ سے عادی ہو رہے تھے، جب حالت ناقابلِ برداشت ہو گئی تو لکھنؤ کی شہرت سُن کر بڑی اُمیدوں کے ساتھ باوجود ضعیفی و ناتوانی اور بیماری کے وہاں چلے آئے۔ پہلے تو بڑی آؤ بھگت اور خاطر و مدارات ہوئی۔ لوگوں نے بڑی عزت کی اور اُستاد تسلیم کیا، لیکن میر کی طبیعت دربار داری کے لئے مناسب نہ تھی، تعریفی اشعار یا قصائد میں سودا جیسی مہارت نہ تھی اور نہ انشا جیسی برجستہ کلامی۔ عمدہ غزلیں ان کی طبع زاد ہیں۔ کسی کی فرمائش پر غزل کہنے میں تامل ہوتا تھا، میر ایک فطری شاعر تھے کلام میں آمد تھی۔ آورد نہ تھی، یہی وجہ ہوئی کہ شاہی دربار میں اس قدر رسوخ نہ ہو سکا جیسی کہ اُنھیں توقع تھی، طبیعت میں تکبّر اور تنگ مزاجی کا پورا پورا اثر تھا۔ بالآخر ہر طرف سے مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ میر کی تصانیف نظم میں سات دیوان ہیں۔ جن میں چھ[۶] دیوان مخصوص غزلوں کے ہیں اور ساتویں میں مفردات وغیرہ ہیں۔ چند قصائد و مخمسات کچھ ترجیع بند و ہشت بند اور بتیس[۳۲] چھوٹی چھوٹی مثنویاں ان کے علاوہ ہیں۔

انتخابِ کلامِ میر

ایک وزن

بحر مضارع ۸ - رکنی نمبر (۲) مفعولُ فاع لاتُ مفاعیلُ فاع لن یا فاع لات

(۱)

تھا مستعار[۱] حسن سے اُس کے جو نور تھا — خرشید[۲] میں بھی اُس ہی[۳] کا ذرّہ ظہور[۴] تھا
ہنگامہ گرم کن[۵] جو دلِ ناصبور[۶] تھا — پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور[۷] تھا
پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں[۸] — معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

---

۱ مستعار بمعنی عارضی، مانگا ہوا ۱۲ ۲ خرشید (سورج) کو خور بھی کہتے ہیں اور جب تنہا خور لکھتے ہیں تو واؤ سے لکھتے ہیں تاکہ خر (گدھا) سے اس کا املا ملنے نہ پائے۔ یہ لفظ مرکب ہے۔ خور بمعنی سورج شید بمعنی روشن ۱۲ ۳ اُس ہی اگرچہ صحیح لفظ ہے مگر مدت سے اس کی جگہ اُسی بغیر ہی کے بولتے ہیں ۱۲

۴ ذرّہ ظہور بھی پرانا روزمرہ ہے اب ذرا ظہور کہتے ہیں جس کا مفہوم برائے نام ہے ۱۲

۵ ہنگامہ گرم کن کے لفظی معنی شور و غل کرنے والا، زندگی کی چہل پہل سے مراد ہے ۱۲ ۶ ناصبور بمعنی بے صبر۔ صبور کے صاد کو زبر (فتحہ) ہے پیش غلط ہے ۱۲ ۷ شورِ نشور بمعنی حشر ۱۲ ۸ تئیں بمعنی تک یا کو، پرانی زبان ہے۔ اب اکثر فصحا نہیں بولتے۔ اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے آپ کو پہچاننا درحقیقت خدا کو پہچاننا ہے۔ بہت دور ہونا اردو کا محاورہ ہے، جس کا مطلب پہنچا ہوا۔ یا دور کی سوچنے والا یعنی ہوشیار ۱۲

آتشِ بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم — یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا
مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر — کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا
منعم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا — اُس رند کی بھی رات کٹی جو کہ عور تھا
ہم خاک میں ملے، تو ملے، لیکن اے سپہر — اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

قطعہ

کل پائوں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا — یکسر وہ استخوانِ شکستہ سے چُور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُر غرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

---

۱ اس شعر میں حضرت موسیٰ جن کا لقب کلیم اللہ تھا اُن کے اور کوہ طور کے واقعے کی تلمیح یا اشارہ ہے مدعا یہ ہے کہ اگر دل کی آگ کا شعلہ بلند ہوتا تو وہ ایک شعلۂ طور جیسے سَو پہاڑوں کے لئے ایسی بجلی بن جاتا جو خرمن (کھلیان) کو جلا دیتی ہے ۱۲ ۲ پرتَو بمعنی شعاع، روشنی - اُردو کے پُرانے روزمرّہ میں پرتوا بھی بولتے تھے اُسی لحاظ سے پرتوے کہا گیا ہے ورنہ صحیح فارسی کا لفظ پَرتَو ہے ۱۲ ۳ پتنگ بمعنی پروانہ، ۱۲ ۴ بے حضور، بمعنی غیر حاضر، غائب - مدعا یہ ہے کہ کائنات کی مجلس میں تیرا ظہور نہ ہوتا تو کوئی چیز موجود نہ ہوتی ۱۲ ۵ منعم، بمعنی مالدار، امیر ۱۲
۶ قاقم و سنجاب، نرم کپڑوں اور پوستین کو کہتے ہیں۔ قاقم و سنجاب اُن جانوروں کے نام ہیں جن کی کھال کے لباس بنتے ہیں ۱۲ ۷ عور، بمعنی عریاں، ننگا، اور رند سے مراد آزاد اور مفلس ہے ۱۲
۸ سپہر بمعنی آسمان ۱۲ ۹ یکسر یعنی سراسر، بالکل، اور استخواں ہڈی کو کہتے ہیں ۱۲
۱۰ کبھو، پرانی زبان ہے۔ اب کبھی بولتے ہیں ۱۲

(۲)

اس عہد میں الٰہی قیامت کو کیا ہوا — چھوڑا وفا کو اُن[1] نے مُروّت کو کیا ہوا
اُمّیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے — آتے ہی آتے یارو قیامت[2] کو کیا ہوا
بخشش[3] نے مجکو ابرِ کرم کی، کیا خجل — اے چشم! جوشِ اشکِ ندامت کو کیا ہوا
جاتا ہی یار تیغ بکف[4] غیر کی طرف — اے کُشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

(۳)

دعویٰ کیا تھا گُل نے ترے رُخ سے باغ میں — سیلی[5] لگی صبا کی سو[6] مُنھ لال ہوگیا

(۴)

موجیں[7] کرے ہی بحرِ جہاں میں ابھی تو تُو — جانے گا بعدِ مرگ کہ عالم حباب تھا

---

[1] اُن نے، پُرانی زبان ہی، اب اُس نے بولتے ہیں ۱۲ [2] یعنی اُس نے قیامت کے دن دیدار دکھانے کا وعدہ کیا تھا مگر قیامت نہیں آتی اور اُمیدوار مرے جاتے ہیں ۱۲ [3] گناہگار اپنی خطاؤں پر نادم ہوتا ہی تو رحمت الٰہی جوش میں آتی ہی اور اُس کی بخشش ہو جاتی ہی۔ اس خیال کے مطابق کہا گیا ہی کہ ابر کرم (رحمت) کی مہربانی سے میں شرمندہ ہوں۔ مگر اے آنکھ تیرے اشکِ ندامت کے جوش کو کیا ہو گیا ہی کہ وہ نہیں اُٹھا ۱۲ [4] تیغ بکف، تلوار کھینچے ہوئے یا لئے ہوئے۔ مدعا یہ ہی کہ وہ تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے غیر کی طرف جا رہا ہی، اے کُشتۂ ستم (عاشقِ صادق) تیری غیرت یہ کس طرح گوارا کر رہی ہی کہ تیرے ہوتے ہوئے وہ غیر کی طرف جائے ۱۲ [5] سیلی بروزن جیلی یا تیلی یعنی طمانچہ۔ تھپیڑا۔ کوڑا ۱۲ [6] سو اُردو میں کئی معنوں میں بولا جاتا ہی۔ یہاں کاف بیانیہ (کہ) کا مفہوم ادا کرتا ہی۔ جس کا دوسرا مفہوم "اس لئے" یا "اس بنا پر" سمجھنا چاہیے ۱۲

[7] موجیں کرنا بمعنی خوش ہونا، مزے اُڑانا۔ کرے ہی پُرانی زبان ہی، اب کرتا ہی بولتے ہیں ۱۲

اُگتے تھے دستِ بلبل و دامانِ گل بہم — صحنِ چمن نمونۂ یوم الحساب تھا
ٹک دیکھ آنکھیں کھول کے اُس دم کی حسرتیں — جس دم یہ سوجھے گا کہ یہ عالم بھی خواب تھا

(۵)

اے تو، کہ یاں سے عاقبتِ کار جائے گا — غافل نہ رہ کہ قافلہ یک بار جائے گا
موقوف حشر پر ہے، سو آتے بھی وے نہیں — کب درمیاں سے وعدۂ دیدار جائے گا
آنے میں اس کے حال ہوا جائے ہے تغیر — کیا حال ہوگا پاس سے جب یار جائے گا

(۶)

ہے اُس کے حرفِ زیر لبی کا سبھوں میں ذکر — کیا بات تھی کہ جس کا یہ بِستار ہو گیا

---

۱ یوم الحساب قیامت کے دن کو کہتے ہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ چمن میں بلبل کے ہاتھ اور پھول کا دامن اس طرح ایک دوسرے سے دست و گریبان (ملے ہوئے) نظر آتے تھے جس طرح قیامت کے دن پرسش اور دار و گیر کی حالت میں ہنگامہ آرائی ہوگی ۱۲ ۲ ٹک۔ یعنی ذرا۔ پرانی زبان ہے اب نہیں بولتے ۱۲ ۳ عاقبتِ کار۔ بالآخر۔ ایک دن ۱۲ ۴ سو، یہاں حرفِ جزا کے معنی دیتا ہے بمعنی لیکن ۱۲ ۵ وے۔ اب متروک ہے۔ وہ بولتے ہیں ۱۲ ۶ تغیر عربی الاصل تغییر بروزن تفعیل ہے جس کے معنی انقلاب کے ہیں، فارسی شعرا نے تغیر بروزن فعیل بھی استعمال کیا ہے۔ اسی اتباع سے اردو میں کہا جاتا ہے ۱۲ ۷ حرفِ زیر لبی، یعنی بہت آہستہ گفتگو کرنا، منھ ہی منھ میں کچھ کہنا ۱۲ ۸ بِستار، ب کے زیر اور پیش سے بولا جاتا ہے پیش کا استعمال عورتوں میں زیادہ ہے۔ ہندی لفظ ہے جو شہرت۔ طول کلامی۔ پھیلاؤ اور وسعت کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ مگر اب اردو میں متروک ہے ۱۲

(۷)

داغِ فراق و حسرتِ وصل، آرزوئے شوق
میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا

(۸)

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری[۱] چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

گرمیِ عشق مانعِ نشو[۲] و نما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

مستی میں چھوڑ[۳] دیر کو، کعبے چلا تھا میں
لغزش بڑھی ہوئی تھی و لیکن[۴] سنبھل گیا

(۹)

گزرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ[۵] کا
خانہ خراب ہوجیو[۶] اس دل کی چاہ کا

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں
مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ[۷] نگاہ کا

یک قطرہ خون ہوکے پلک سے ٹپک پڑا
قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں[۸] پناہ کا

بدنام و خوار و زار و نزار[۹] و شکستہ حال
احوال کچھ نہ پوچھئے اس روسیاہ کا

ظالم زمیں سے لوٹتا دامن، اُٹھا کے چل
ہوگا کسو[۱۰] میں ہاتھ کسو داد خواہ کا

---

[۱] تیوری بروزن توری بغیر اظہار واؤ لکھنؤ میں عموماً بولا جاتا ہے مگر دہلی میں میر و سودا وغیرہ کے بعد بروزن ریوڑی واؤ کے اظہار سے بولتے ہیں۔ تیوری چڑھانا، چین بجبیں ہونے، آنکھیں بدلنے اور غصہ ہونے کے معنی میں بولتے ہیں ۱۲ [۲] نشو و نما، بمعنی پیدائش و افزائش۔ نمود و نمائش ۱۲ [۳] چھوڑ۔ چھوڑ کر کی جگہ قدما بولتے تھے اب نہیں بولتے ۱۲ [۴] و لیکن بھی اب متروک ہے۔ صرف لیکن بولتے ہیں ۱۲ [۵] پگاہ بمعنی صبح۔ سحر۔ تڑکا ۱۲ [۶] ہو کی جگہ ہوجیو پرانے لوگ بولتے تھے اب فصیح نہیں ۱۲ [۷] صرفہ۔ یہ لغتِ اضداد میں ہے یعنی دو مخالف معنی ہیں۔ خرچ کرنے کے بھی معنی ہیں اور بخل کے بھی یہاں بخل اور کنجوسی کا مفہوم ہے ۱۲ [۸] غفراں پناہ، قابل مغفرت۔ مرحوم، مغفور ۱۲ [۹] زار و نزار بمعنی ناتوان و نحیف ۱۲ [۱۰] کسو پرانی زبان ہے اب کسی فصیح ہے ۱۲

اے تاجِ شہ! نہ سر کو فرولاؤں[1] تیرے پاس ہے معتقد فقیر نمد[2] کی کلاہ کا

(۱۰)

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہے گا دل تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا
اب دیکھ لے، کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہے چاک پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا
گو بے ستوں[3] کو ٹال دے۔ آگے سے کوہکن سنگِ گرانِ عشق اُٹھایا نہ جائے گا
یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ نادان! پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

(۱۱)

مت رنجہ[4] کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد دل ڈھائے[5] کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا
میں صیدِ ناتواں ہوں تجھے کیا کروں گا یاد ظالم اک اور تیر لگایا تو کیا ہوا
کیا کیا دعائیں مانگے[6] ہیں خلوت میں شیخ یوں ظاہر جہاں سے ہاتھ اُٹھایا تو کیا ہوا
وہ فکر کر کہ چاکِ جگر پاوے[7] التیام[8] ناصح جو تو نے جامہ[9] سلایا تو کیا ہوا
جیتے تو اُن نے میرؔ مجھے داغ ہی رکھا پھر گور پر چراغ جلایا تو کیا ہوا

[1] سر فرولانا یعنی سر کو عاجزی سے جھکانا ۱۲ [2] نمد۔ نمدا۔ پُرانا دُھرانا کمبل یا اون کا ٹکڑا جس کی ٹوپی غریب و فقیر پہنتے ہیں ۱۲ [3] بے ستون۔ اُس پہاڑ کا نام ہے جس کو شیریں کے لئے کوہکن (فرہاد) نے کاٹا تھا ۱۲ [4] مت رنجہ کر یعنی خفا نہ کر۔ اپنے اعتقاد میں۔ اپنے نزدیک۔ یہ پُرانی زبان ہے۔ اب نہیں بولتے ۱۲ [5] ڈھائے کر یعنی منہدم کر کے۔ گرا کر۔ یہ بھی پُرانی بولی ہے۔ اب ڈھا کر بولتے ہیں۔ دل کا استعارہ کعبے سے کیا ہے ۱۲ [6] مانگے ہے کی جگہ اب مانگتا ہے فصیح ہے ۱۲ [7] پاوے بھی اب نہیں بولتے۔ پائے بغیر واو کے فصیح و صحیح ہے ۱۲ [8] التیام یعنی زخم کا اچھا ہونا ۱۲ [9] جامہ پُرانے زمانے میں ڈھیلا ڈھالا لباس عبا قبا کی طرح ہوتا تھا اور عموماً بمعنی لباس کے ہے ۱۲

(۱۲)

قطعہ

آئی نظر جو گورِ سلیماں کی ایک روز | لوحے[1] پر اُس مزار کے تھا یہ رقم ہوا[2]
کاے[3] سرکشاں جہان میں کھینچا تھا میں بھی سر | پایانِ کار[4] مور کی خاکِ قدم ہوا
کیا کیا عزیز دوست ملے ہیں خاک میں | نادان! یاں کسو کا کسو کو بھی غم ہوا

(۱۳)

رنگ اُڑ چلا چمن میں گلوں کا تو کیا نسیم | ہم کو تو روزگار نے بے بال و پر کیا
نافع[5] جو تھیں مزاج کو اول سو عشق میں | آخر انھیں دواؤں نے ہم کو ضرر[6] کیا
کیا جانوں[7] بزمِ عیش کہ ساقی کی چشم دیکھ | میں صحبتِ شراب سے آگے سفر کیا
جس دم کہ تیغِ عشق کھنچی، بوالہوس[8] کہاں | سُن لیجئے کہ ہم ہی[9] نے سینہ سپر[10] کیا

---

[1] لوحہ - لوحِ مزار، قبر کی تختی ۱۲ [2] رقم ہوا، بمعنی لکھا ہوا - پُرانی زبان ہے فارسی رقم شدہ کا ترجمہ ۱۲ [3] کاے - اس کا تلفظ (کے) ہوگا - یہ کہ اے کا مخفف ہے اور یہ استعمال حسب قاعدۂ فارسی ہے ۱۲ [4] پایانِ کار - یعنی بالآخر - نتیجے میں ۱۲ [5] نافع، نفع دینے والا مفید ۱۲ [6] ضرر بمعنی نقصان ۱۲ [7] کیا جانوں - پرانی زبان ہے - اب کیا معلوم کیا جانے صحیح ہے - شعر کا مفہوم ہے کہ مجھے بزمِ عیش کی کیا خبر میں تو ساقی کی آنکھ ہی دیکھکر دورِ شراب کی صحبت سے پہلے ہی مرگیا ۱۲ [8] بوالہوس - ہوس ناک - جھوٹا عاشق ۱۲ [9] ہم ہی کی جگہ اب ہمیں فصیح ہے ۱۲ [10] سپر - بمعنی ڈھال - سینہ سپر کرنا - سامنے آنا - نشانہ بننا ۱۲

وہ دشتِ خوف ناک رہا ہی مرا وطن　　سُن کر جسے خضر[1] نے سفر سے حذر[2] کیا

(۱۴)

کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہی　　چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا
گر زمزمہ[3] یہی ہی کوئی دن تو ہم صفیر[4]　　اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا

(۱۵)

دل عشق میں ہمیشہ حریفِ[5] نبرد[6] تھا　　اب جس جگہ کہ داغ ہی یاں آگے درد تھا

(۱۶)

قطعہ

یاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول　　گل گشت[7] سرسری نہیں اس گلستان کا
گُل یادگار چہرۂ خوباں[8] ہی بے خبر!　　مرغِ چمن نشاں ہی کسو خوش بیان کا

(۱۷)

طالع جو خوب تھے نہ ہوا جاہ کچھ نصیب　　سر پر مرے کروڑ برس تک ہُما[9] پھرا

---

[1] خِضر۔ بکسر حرف اول وسکون دوم۔ اور بفتح حرف اول و دوم۔ اور بفتح اول وکسرۂ دوم، تینوں طرح مستعمل ہی۔ ایک پیغمبر کا لقب جن کا اصلی نام ارمیا ہی اور جن کے متعلق شعرا میں آب حیات اور رہنمائی کے قصص و روایات بہت مشہور ہیں یعنی وہ بھٹکے ہوؤں کی رہنمائی کرتے ہیں، اور آب حیات پینے کی وجہ سے زندۂ جاوید ہیں ۱۲ [2] حذر کرنا۔ پرہیز کرنا۔ بچنا۔ بھاگنا ۱۲ [3] زمزمہ۔ ہلکے ہلکے گانا۔ گنگنانا چہچہا۔ نغمہ ۱۲ [4] صفیر بمعنی آواز۔ ہم صفیر۔ ہم آواز۔ ساتھی ۱۲ [5] حریف بمعنی ہمسر۔ مقابل ۱۲ [6] نبرد۔ لڑائی۔ جنگ ۱۲ [7] گل گشت بمعنی سیر چمن۔ اب اس لفظ کو مونث بولتے ہیں ۱۲ [8] خوباں بمعنی خوب صورت ۱۲ [9] ہما عنقا کی طرح ایک فرضی اور مشہور پرند ہی جس کو متبرک و مبارک مانا جاتا ہی اور اُس کی پرواز کا یہ اثر کہا جاتا ہی کہ جس کے سر پر وہ پھر جائے یا بیٹھ جائے تو وہ بڑا آدمی ہو جاتا ہی اور دنیاوی جاہ و عزت نصیب ہو جاتی ہی ۱۲

دیر و حرم میں کیوں کر[۱] قدم رکھ سکے گا میرؔ — ایدھر[۲] تو اُس سے بُت پھرے اودھر[۳] خدا پھرا

(۱۸)

پوشیدہ راز عشق چلا جائے تھا[۴]، سو آج — بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اُٹھا دیا

اس موج خیز دہر میں ہم کو قضا نے آہ — پانی کے بلبلے[۵] کی طرح سے مٹا دیا

سب شورِ ما و من[۶] کو لیے سر میں مر گئے — یاروں کے اُس فسانے نے آخر سُلا دیا

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں[۷] — مُشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا

تکلیف دردِ دل کی عبث ہم نشیں نے کی — دردِ سخن نے میرے سبھوں کو رُلا دیا

(۱۹)

کیا بعدِ مرگ یاد کروں گا وفا تجھے — سہتا رہا جفائیں میں جب تک جیا کیا

(۲۰)

عالم[۸] کی سیر میرؔ کی صحبت میں ہو گئی — طالع سے میرے ہاتھ یہ بے دست و پا لگا

(۲۱)

جس شعر پہ سماع[۹] تھا کل خانقاہ میں — وہ آج میں سُنا تو ہے میرا کہا ہوا

---

۱ کیوں کر پُرانی زبان ہے۔ اب اس جگہ کیوں کر یا کس طرح بولتے ہیں ۱۲ ۲ ۳ ایدھر، اُودھر بھی پُرانا روزمرہ ہے۔ اب اِدھر اُدھر بولتے ہیں ۱۲ ۴ چلا جائے تھا، پُرانا روزمرہ ہے۔ اب چلا جاتا تھا کہیں گے ۱۲ ۵ بلبلا بمعنی حباب ۱۲ ۶ ما و من بمعنی خودی، غرور شیخی ۱۲ ۷ میں نشان کی جگہ اب میں نے نشان، صحیح و فصیح ہے ۱۲ ۸ اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ میرؔ کو بے دست و پا دیکھکر سمجھ میں آگیا کہ دنیا کی سیر کا یہ نتیجہ ہے کہ بالآخر بے دست و پا ہونا پڑتا ہے۔ یعنی کسی کو کسی بات پر قابو نہیں، انسان سراپا مجبور ہے گویا میرؔ کو دیکھکر عبرت ہوئی اور جان لیا کہ عالم کی سیر لاحاصل ہے ۱۲ ۹ سَماع بمعنی قوالی۔ حال قال کی مجلس ۱۲

(۲۲)

پھرتا ہی زندگی کے لئے آہ خوار کیا — اس وہم کی نمود کا ہی اعتبار کیا
صحبت رہی بگڑتی ہی اُس کینہ ور سے آہ — ہم جانتے نہیں ہیں کہ ہوتا ہی پیار کیا

(۲۳)

قطعہ

کل، میں کہا وہ طور کا شعلہ کہاں گرا — دل نے جگر کی اُور[1] اشارت کی یاں گرا
کیا کم تھا شعلہ شوق کا شعلے سے طور کے — پتھر بھی واں[2] کے جل گئے جا کر جہاں گرا

(۲۴)

آتے ہی آتے تیرے یہ ناکام ہو چکا — واں کام ہی رہا تجھے یاں کام[3] ہو چکا
تڑپے ہی جب کہ سینے میں اُچھلے ہی دو دو ہاتھ — گر دل یہی ہے میرؔ تو آرام ہو چکا

(۲۵)

صاحب[4] ہو مار ڈالو مجھے تم، وگرنہ کچھ — جز عاشقی گناہ نہیں ہی غلام کا

(۲۶)

کیوں کر بسر کرے غم و غصے میں ہجر کے — خوگر ہو جو کسو کے کوئی التفات کا
واعظ کہے سو سچ ہی ولے[5] مے فروش سے — ہم ذکر بھی سُنا نہیں صوم و صلات کا

---

[1] اُور بر وزن گور یعنی طرف۔ سمت۔ یہ پرانی زبان ہی اب نہیں بولتے ۱۲ [2] واں۔ یاں وہاں، یہاں کا مخفف ہی۔ اب فصحائے عصر بہت کم بولتے ہیں ۱۲ [3] کام ہو چکنا، یعنی تمام ہو جانا۔ مرجانا ۱۲ [4] صاحب یعنی مالک و مختار ۱۲ [5] ولے بمعنی مگر۔ لیکن۔ اب متروک ہی ۱۲

عالم کسو حکیم کا باندھا طلسم[۱] ہے — کچھ ہو تو اعتبار بھی ہو کائنات کا

(۲۷)

قطعہ

مکّے گیا، مدینے گیا، کربلا گیا — جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آ گیا
دیکھا ہو کچھ اس آمد و شد[۲] میں تو میں کہوں — خود گم ہوا ہوں بات[۳] کی تہ آپ پا گیا

(۲۸)

نے[۴] ہم سے کچھ نہ اُس ستم ایجاد سے ہوا — ظلمِ صریح[۵] عشق کی امداد سے ہوا

(۲۹)

سائے میں تاک[۶] کے مجھے رکھا اسیر کر — صیاد کے کرم سے قفس آشیاں ہوا
ہم نے نہ دیکھا اُس کو سو نقصانِ جاں کیا — اُن نے جو اک نگاہ کی اُس کا زیاں[۷] ہوا
وے تو کھڑے کھڑے مرے گھر آ کے پھر گئے — میں بے دیار و بے دل و بے خانماں[۸] ہوا

(۳۰)

جانا نہ تھا سرہانے سے مجھ مختصر[۹] کے ہائے — کیا وقت رہ گیا تھا کہ وہ مُنھ چھپا گیا
آشفتہ سر[۱۰] ہیں سرو، گریباں[۱۱] دریدہ گُل — بیٹھا کہاں چمن میں کہ فتنہ اُٹھا گیا

---

[۱] طِلِسم۔ تماشائے عجیب، وہمی خیالات۔ نیرنجات، جو دھوکا دینے کے لئے بنائے یا دکھائے جاتے ہیں ۱۲
[۲] آمد و شد یعنی آمد و رفت، آنا جانا ۱۲ [۳] بات کی تہ پانا۔ اصل مطلب تک پہنچ جانا ۱۲ [۴] نے، اب نہیں بولتے نہیں یا صرف (نہ) بولتے ہیں ۱۲ [۵] ظلمِ صریح، کھلا ہوا ظلم ۱۲ [۶] تاک۔ انگور کی بیل یا انگور ۱۲ [۷] زیاں یعنی نقصان ۱۲ [۸] بے خانماں، بے گھرا۔ برباد ۱۲ [۹] مختصر۔ کنایہ ہے جلد مر جانے والے سے۔ بہت کم جینے والا ۱۲
[۱۰] آشفتہ سر، پریشان، آوارہ ۱۲ [۱۱] گریباں دریدہ، گریباں کو اردو میں کنٹھا کہتے ہیں جو انگرکھے یا کُرتے کے گلے میں ہوتا ہے۔ اس کے لفظی معنی پھٹے ہوئے گریبان کے ہیں اور مراد پریشاں حالی سے ہے ۱۲

گلبرگ[1] سے بھرے تھے، کبھی تو، کنار[2] و جیب — کیا کیا سمیں[3] یہ گریۂ خونیں دکھا گیا
خط بھیج کر بھی شوق کی باتیں چلی گئیں — قاصد کے پیچھے دُور تلک میں لگا گیا
روتا ہوں یوں کہ برسے ہے شدت سے جیسے مینہ — جوں ابر میرے دل پہ غمِ عشق چھا گیا
ہستی مری کہ ہیچ تھی، میں منفعل رہا — اس شرم سے ندان[4] زمین میں سما گیا

داغِ دلِ خراب شبوں کو جلے ہے میر
عشق اس خرابے میں بھی چراغ اک جلا گیا

دوسرا وزن

بحرِ ہزج ۸ رکنی نمبر (۳) = مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن یا فعولان

(۱)

کیا میں بھی پریشانیِ خاطر سے قریں[5] تھا — آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غم دیدہ کہیں تھا
آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لئے لیکن — ہونٹوں پہ مرے جب نفسِ[6] باز پسیں تھا

---

۱ گلِ برگ یعنی پھول پتی ۱۲ ۲ کنار بمعنی گود۔ پہلو ۱۲ ۳ سمیں، سماں بمعنی منظر، اردو کا لفظ ہے۔ اس کی جمع سمیں خلاف روزمرہ ہے۔ کیوں کہ مذکر لفظ کی جمع ی، ن سے نہیں بنائی جاتی۔ بہرحال آج کل فصیح نہیں۔ زیادہ سے زیادہ سمے (یائے مجہول سے) بول سکتے ہیں ۱۲
۴ ندان۔ نادان کا مخفف۔ پرانی زبان ہے اب نہیں بولتے ۱۲ ۵ قریں، بمعنی قریب نزدیک ۱۲
۶ نفسِ باز پسیں، آخری سانس۔ نفس کی ف کو زبر (فتحہ) ہے اور جب نفس کی ف کو جزم ہے وہ بمعنی ذات ہے ۱۲

شب کوفت[1] سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ
جو درد و الم تھا سو[2] کہے تو کہ وہیں تھا

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں[3] کا
جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیرِ نگیں[4] تھا

مسجد میں امام آج ہوا آکے وہاں سے
کل تک تو یہی میر خرابات نشیں[5] تھا

منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا
(۲) پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا

چھوٹوں کہیں ایذا سے لگا ایک ہی جلاد
تا حشر مرے سر پہ یہ احسان رہے گا

چمٹے[6] رہیں گے دشتِ محبت میں سر و تیغ
محشر تئیں خالی نہ یہ میدان رہے گا

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
(۳) کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق[7] کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری[8] کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا[9] ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخم جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

---

[1] کوفت بمعنی صدمہ، تکلیف ۱۲ [2] سو بمعنی وہ، اسم اشارہ، کہے تو بمعنی گویا ۱۲ [3] انھوں کا پرانا روزمرہ ہے، اب ان کا بولتے ہیں ۱۲ [4] زیرِ نگیں، بمعنی ماتحت، قبضے میں نگیں کے معنی انگوٹھی کے ہیں جس کو مُہر بھی کہتے ہیں، جو حکومت و سلطنت کے احکام پر ثبت کی جاتی ہے جس سے حکومت کے قبضے کا ثبوت ملتا ہے ۱۲ [5] خرابات نشیں، بمعنی ویرانہ نشیں۔ شراب خانے کا رہنے والا۔ پچھلے زمانے میں ایسے مقامات غیر آباد جگہوں میں زیادہ بنتے تھے ۱۲ [6] چمٹنا، یعنی چپٹنا۔ پچاس برس پہلے تک یہ لفظ میم سے بولا جاتا تھا مگر اب میم کی جگہ (پ) فصیح ہے ۱۲ [7] آفاق۔ زمانہ۔ دنیا ۱۲ [8] سفری بمعنی مسافر ۱۲ [9] مداوا، میم مضموم، بمعنی علاج۔ تدبیر ۱۲

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی، پھر وہیں دیکھو — آئینے کو لپکا[1] ہے پریشاں نظری کا

صد[2] موسمِ گل ہم کو تہِ بال ہی گزرے — مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا

ٹک میرِ جگر سوختہ کی جلد خبر لے

کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

(۴)

حق ڈھونڈھنے کا آپ کو آتا نہیں ورنہ — عالم ہے سبھی یار، کہاں یار نہ پایا

مربوط[3] ہیں تجھ سے ہی سبھی ناکس و نااہل — اس باغ میں ہم نے گلِ بے خار نہ پایا

(۵)

دل پہنچا ہلاکی کو نپٹ[4] کھینچ کسالا[5] — لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ

کچھ میں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث — برہم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالا[6]

معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر — مسجد میں ہے کیا شیخ! پیالہ نہ نوالا

گزرے ہے لہو واں سرِ ہر خار سے اب تک — جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پانوں کا چھالا

---

۱ لپکا، لت، عادت ۱۲ ۲ اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ سیکڑوں موسمِ بہار ہم کو اُڑتے ہوئے گزرے کبھی اتنا مقدور یعنی قدرت نہ ہوئی کہ بے بال و پر ہو کر کہیں بیٹھتے اور موسمِ گل کا لطف اُٹھاتے۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ ساری عمر پریشانی ہی میں گزری۔ بال بمعنی بازو ہے۔ طائر جب اُڑتا ہے تو اُس کے بازو پھیل جاتے ہیں اور اس شکل کے قائم ہو جانے پر زمین کا حصہ پر اور بازوؤں کے نیچے رہتا ہے اسی کو تہ بال کہا گیا ہے۔ یہ شعر علم معنی و بیان میں بدیع واقع ہوا ہے یعنی اس بیان میں ایک خاص جدت ہے۔ اسی کو بدیع کہتے ہیں ۱۲ ۳ مربوط یعنی وابستہ۔ ملا ہوا ۱۲ ۴ نپٹ بمعنی نہایت۔ بہت، پرانا لفظ ہے اب بالکل نہیں بولتے ۱۲ ۵ کسالا، تکلیف، ایذا ۱۲ ۶ رسالہ، فوج کے ایک دستے کو کہتے ہیں، دل کے انتشار اور پریشانی کو رسالے سے تعبیر کیا ہے ۱۲

جس گھر میں ہو جلوے سے ترے چاندنی[1] کا فرش
واں چادرِ مہتاب[2] ہے مکڑی کا سا جالا

دیکھے ہے مجھے دیدۂ پُرخشم[3] سے وہ میرؔ
میرے ہی نصیبوں میں تھا یہ زہر کا پیالا[4]

(۶)

قطعہ

یہ میرؔ ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا
انداز سخن کا سببِ شور و فغاں تھا

جادو کی پُڑی[5] پرچۂ ابیات تھا اُس کا
مُنھ تکیے غزل پڑھتے، عجب سحر بیاں تھا

جس راہ سے وہ دل زدہ[6] دلّی میں نکلتا
ساتھ اُس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا

افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ[7] خاک
آندھی تھا، بلا تھا، کوئی آشوبِ جہاں[8] تھا

غافل تھے ہم احوالِ دلِ خستہ سے اپنے
وہ گنج[9]، اسی کُنجِ خرابہ میں نہاں تھا

---

[1] چاندنی، صاف وشفاف اور سفید فرش ۱۲ [2] چادرِ مہتاب، چاندنی ۱۲ [3] پرخشم، غصّے سے بھرا ہوا ۱۲
[4] پیالے کا صحیح تلفظ ی کو ظاہر کرکے ہی جیسا کہ اسی غزل کے تیسرے شعر میں موزوں ہوا ہی، مگر یہاں بیالے مخلوط (بغیر ظاہر کئے ہوئے) کہا ہی یہ پرانی روش ہی ۱۲ [5] پُڑی، پڑیا کی جگہ کہا ہی اب پُڑی شمالی ہند میں فصیح نہیں ہی جادوگر مختلف صورتوں اور عملوں سے جادو کا اثر پھیلایا کرتے ہیں، انھیں میں یہ عمل بھی ہوتا ہی کہ کسی سفوف یعنی پسی ہوئی چیز کو پڑیا میں باندھ کر اُس مقام پر رکھ دیتے ہیں جہاں جادو کا اثر ڈالنا منظور ہوتا ہی۔ اُسی کو جادو کی پڑیا کہتے ہیں ۱۲
[6] دل زدہ۔ دل کا مارا ہوا۔ عاشق ۱۲ [7] آب زدہ، پانی سے بھیگا ہوا ۱۲
[8] آشوبِ جہاں۔ آفتِ روزگار۔ ہنگامۂ عالم ۱۲ [9] کُنج بمعنی گوشہ، اس میں کاف ہی اور جس میں گاف ہی وہ خزانے کے معنی میں ہی ۱۲

گو میسر جہاں میں کنھوں[1] نے تجکو نہ جانا — موجود نہ تھا تو، تو کہاں نام و نشاں تھا

(۷)
دن، جی کے اُلجھنے ہی کے جھگڑے میں کٹے ہے — رات اُس کے خیالات سے رہتے ہیں قضایا[2]

(۸)
تحقیق[3] کروں کس سے حقیقت کے نشے کو — خضر آب اُسے کہتا ہے، آتش کہے موسیٰ

(۹)
جب زمزمہ کرتی ہے صدا[4] چبھتی ہے دل میں — بلبل سے کوئی سیکھ لے انداز سخن کا

تیسرا وزن

بحر رَمَل ۸ رکنی نمبر (۲) = فاعِلاتن فِعِلاتن فِعِلاتن فَعِلن یا فعلات یا فَعلن یا فعلات

(۱)

لطف اگر یہ ہے بتاں! صندلِ پیشانی[5] کا — حسن کیا صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا

---

۱ کنھوں یعنی کسی نے، اب نہیں بولتے ۱۲ ۲ قضایا، یعنی جھگڑے۔ قصے، مقدمات ۱۲
۳ اس شعر میں حضرت خضر اور حضرت موسیٰ کے واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ آب حیات کا تعلق خضرؑ سے اور تجلّیِ طور (آتش فشانی) موسیٰؑ سے متعلق ہے، مدعا یہ ہے کہ عرفانِ حقیقت کو ایک آبِ حیات سے وابستہ کرتا ہے دوسرا آتش طور سے۔ لفظ نشہ بروزن پشہ صحیح ہے۔ پرانے زمانے میں نشا بروزن عشا بھی بولتے تھے۔ اب محتاط شعرا نشاہ استعمال کرتے ہیں ۱۲ ۴ صدا بمعنی آواز، اور سدا (سین سے) اُردو کا لفظ ہے جو بمعنی ہمیشہ ہے ۱۲ ۵ زینت و آرائش کے لیے حسین اپنی پیشانی پر صندل لگاتے ہیں، اُس پیشانی کو حسنِ صبح سے تشبیہ دے کر، حسین چہرے کے مقابل میں صبح کے حسن کو گھٹایا گیا ہے ۱۲

کفر[1] کچھ چاہیئے اسلام کی رونق کے لئے — حسن، زنّار ہے تسبیحِ سلیمانی کا
درہمی حال کی ہے سارے مرے دیوان میں — سیر[2] کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا
جان گھبراتی ہے اندوہ سے تن میں کیا کیا — تنگ احوال ہے اس یوسفِ[3] زندانی کا
کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کے تئیں — ہے بڑا حیف[4] ہمیں اپنی بھی نادانی کا
اُس کا منھ دیکھ رہا ہوں سو[5] وہی دیکھوں ہوں — نقش کا سا ہے سماں میری بھی[6] حیرانی کا
بُت پرستی کو تو اسلام نہیں کہتے ہیں — معتقد کون ہے میرؔ ایسی مسلمانی کا

[1] یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر چیز کی شناخت ضد اور مقابل سے ہوا کرتی ہے، بھلائی بُرائی، سفیدی سیاہی سے پہچانی جاتی ہے۔ اسی کلّیے کو پیش نظر رکھکر کہا گیا ہے کہ اسلام کی رونق یعنی شناخت کے لئے کفر کا ظہور بھی ہونا چاہیئے، اس دعوے کی دلیل میں تسبیح سلیمانی کا ذکر کیا گیا ہے۔ سلیمانی ایک پتھر کی قسم ہے جس کی تسبیح بنتی ہے اور اُس پتھر کی شناخت یہ ہے کہ اُس پر باریک باریک لکیریں ہوتی ہیں، اُن پتھر کی لکیروں کو بھی زنّار کہتے ہیں، اور ڈورے کو بھی زنّار کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تسبیح ڈورے (زنّار) کے بغیر نہیں بن سکتی۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ زنّار کے بغیر (خواہ وہ سنگ سلیمانی کی لکیریں ہوں یا ڈورا ہو) وہ تسبیح جو عابدوں اور مسلمانوں کی وظیفہ خوانی کا ذریعہ ہے حسنِ تکمیل نہیں پا سکتی ۱۲ [2] اس شعر میں (یہ) پُرانا روزمرہ ہے اب یہاں (اس) بولیں گے سیر کی تذکیر بھی پُرانی بول چال ہے ۱۲ [3] حضرت یوسفؑ کے واقعات میں اُن کا قید ہونا مشہور واقعہ ہے۔ اسی مناسبت سے جان کو جو جسم میں قید رہتی ہے یوسف زندانی کہا گیا ہے ۱۲ [4] حیف، بمعنی افسوس آج کل اس ترکیب سے نہیں بولتے ۱۲ [5] یہاں سو کا مفہوم برابر کا مترادف ہے یعنی لگاتار، مسلسل دیکھے چلا جاتا ہوں۔ دیکھوں ہوں پُرانی زبان ہے ۱۲ [6] بھی اُردو کا حرف عطف ہے نظم کی قید نے اس کو کا سے پہلے موزوں کر دیا ورنہ صحیح ترکیب یہ ہے "میری حیرانی کا بھی نقش کا سا سماں ہے"

(۲)

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا — موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا

اشکِ تر، قطرۂ خوں، لختِ جگر، پارۂ دل — ایک سے ایک عدو آنکھ سے بہتر نکلا

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میرؔ
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

(۳)

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا — اُس کی دیوار کا سر سے مرے سایا نہ گیا

دل کے تئیں[1] آتشِ ہجراں سے بچایا نہ گیا — گھر جلا سامنے پر ہم سے بچایا نہ گیا

دل میں رہ دل میں، کہ معمارِ قضا[2] سے اب تک — ایسا مطبوع[3] مکاں کوئی بنایا نہ گیا

کیا تنک[4] حوصلہ تھے دیدۂ و دل اپنے آہ — ایک دم رازِ محبّت کا چھپایا نہ گیا

دل جو دیدار کا قاتل کے بہت بھوکا تھا — اس ستم پیشہ سے اک زخم بھی کھایا نہ گیا

شہرِ دل آہ عجب جائے[5] تھی پر اُس کے گئے[6] — ایسا اُجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

سر نشینِ[7] رہِ مے خانہ ہوں میں کیا جانوں — رسمِ مسجد کے تئیں شیخ! کہ آیا نہ گیا

(۴)

جی تو ایسے کئی صدقے کیے تجھ پر لیکن — حیف یہ ہے کہ تنک[8] تو بھی پشیماں نہ ہوا

---

۱ کے تئیں، پرانی زبان ہے، اب صرف کو بولتے ہیں ۱۲ ۲ معمارِ قضا سے مراد قدرت ہے ۱۲ ۳ مطبوع بمعنی پسندیدہ، بہتر۔ اچھا ۱۲ ۴ کم حوصلہ۔ ہلکا پن ۱۲ ۵ جائے فارسی کا لفظ ہے ابتداءً مستعمل تھا اب پچاس ساٹھ برس سے اُردو میں صرف جا بولتے ہیں ۱۲ ۶ گئے: یعنی جانے کے بعد۔ یہ بھی پرانی زبان ہے ۱۲ ۷ سر نشیں۔ راستے کے سرے پر بیٹھنے والا۔ میخانہ نشیں ۱۲ ۸ تنک، ہندی لفظ ہے بمعنی ذرا۔ اُردو میں اب متروک ہے ۱۲

آہ میں کب کی[1] کہ سرمایۂ دوزخ نہ ہوئی — کون سا اشک مرا منبعِ[2] طوفاں نہ ہوا

ق

گو توجہ سے زمانے کی جہاں میں مجھ کو — جاہ و ثروت کا میسّر سر و ساماں نہ ہوا

شکر صد شکر کہ میں ذلت و خواری کے سبب — کسی عنوان سے ہم چشمِ عزیزاں نہ ہوا

(۵) شیخ! کیا صورتیں رہتی تھیں بھلا، جب تھا دیر — رو بہ ویرانی[3] ہوا اس کعبے کی آبادی کا

ریختہ[4] رتبے کو پہنچایا ہوا ہے اُس کا — معتقد کون نہیں میر کی اُستادی کا

(۶) دل نہ تھا ایسی جگہ جس کی نہ سدھ لیجے کبھو — اُجڑی اس بستی کو پھر تو نے بسایا ہوتا

دل سے خوش طرح[5] مکاں پھر بھی کہیں بستے ہیں — اس عمارت کو تو ٹک دیکھ کے ڈھایا ہوتا

(۷) میر بھی دیر[6] کے لوگوں ہی کی سی کہنے لگا — کچھ خدا لگتی بھی کہتا جو مسلماں ہوتا

(۸) مجھکو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے — درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا



۱؎ "آہ میں کب کی" پرانی بولی ہے اب "آہ میں نے کب کی" بولتے ہیں ۱۲ ۲؎ منبع۔ پانی کی سوت، مخزن ۱۲ ۳؎ رو بہ ویرانی ہونا۔ تباہ ہونا، ویران ہونا، اُجڑنا۔ مفروضاتِ شعرا میں جہاں اور باتیں نظریے کی طرح مانی جاتی ہیں وہاں یہ بات بھی ہے کہ عابدین و زاہدین اور واعظین وغیرہ کو عموماً مکّار اور بناوٹی کہا جاتا ہے اور اس کے ماتحت اُن کے معبدوں اور خانقاہوں کو بُرا سمجھا جاتا ہے کہ یہ سب دکھاوے کے لئے ہے لیکن یہ سب بطور مجاز و استعارہ صرف اُنھیں لوگوں کے حق میں کہا جاتا ہے جو واقعی مکّار ہیں ۱۲ ۴؎ ریختہ۔ اُردو کی نظم کو اب سے پچاس برس تک ریختہ کہتے تھے ۱۲ ۵؎ خوش طرح یعنی خوش وضع، خوش نما ۱۲ ۶؎ دیر بروزن خیر بمعنی مندر۔ بت خانہ ۱۲

چوتھا وزن

بحر رمل - ۸ رکنی نمبر (۱) = فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعِلن یا فاعلات۔

(۱)

جامۂ[۱] ہستیِ عشق اپنا مگر کم گھیر تھا — دامنِ تر کا مرے دریا ہی کا سا پھیر تھا
دیر میں کعبے گیا میں خانقہ سے اب کی بار — راہ سے مے خانے کی اس راہ میں کچھ پھیر تھا
بلبلوں نے کیا گل افشاں میرؔ کا مرقد کیا
دُور سے آیا نظر تو پھولوں کا اک ڈھیر تھا

(۲)

سیر کے قابل ہی دل صد پارہ اُس نخچیر[۲] کا — جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوست[۳] پیکاں[۴] تیر کا
سب کھلا باغِ جہاں، اِلّا[۵] وہ حیران و خفا — جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ[۶] تھا تصویر کا

---

۱ عشق کے جامۂ ہستی کو دامنِ تر سے مشابہ کر کے کہا گیا ہی کہ میرے دامنِ تر (گناہگاری) کا پھیر تو دریا کی طرح وسیع تھا لیکن شاید ہستی عشق کا جامہ کم گھیر تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسب خواہش عشق سے لذت اندوز نہ ہو سکا۔ خلاصہ مطلب یہ ہی کہ دل کے حوصلے بہت زیادہ اور وسیع تھے مگر اُن کے نکلنے اور پورا ہونے کے لئے میدان کافی نہ تھا ۱۲

۲ نخچیر، شکار، صید ۱۲ ۳ پیوست یعنی سمایا ہوا ۱۲ ۴ پیکان، تیر یا برچھی کا سرا جس کو "انی" کہتے ہیں ۱۲ ۵ اِلّا۔ بمعنی مگر، لیکن ۱۲ ۶ دل کو غنچے سے تشبیہ دے کر کہا ہی کہ میرا دل اس طرح خاموش رہا یعنی نہ کھلا جیسے تصویر غنچہ بے حس و حرکت رہتی ہی ۱۲

کیوں[1] کہ نقاشِ ازل[2] نے نقش[3] ابرو کا کیا
کام ہے اک تیرے منھ پر کھینچنا شمشیر[4] کا

رہ گزر سیلِ[5] حوادث کا ہے بے بنیاد دہر
اس خرابے میں نہ کرنا فکر[6] تم تعمیر کا

بس طبیب! اٹھ جا مری بالیں سے مت دے[7] دردِ سر
کام یاں آخر ہوا، اب فائدہ تدبیر کا

کس طرح سے مانئے یارو! کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

(۳)

جو سنا ہشیار مے خانے میں تھا وہ بے خبر
شوق ہی باقی رہا ہم کو دلِ آگاہ کا

باندھ مت رونے کا تار اے ناقباحت[8] فہم چشم
اس سے پایا جاتا ہے سر رشتہ[9] جی کی چاہ کا

(۴)

خواہ مجھ سے لڑ گیا اب خواہ مجھ سے مل گیا
کیا کہوں اے ہم نشیں میں تجھ سے حاصل دل گیا

دل سے آنکھوں میں لہو آتا ہے شاید رات کو
کش مکش میں بے قراری کی یہ پھوڑا اچھل گیا

---

۱ کیوں کہ، یعنی کس طرح۔ اب کیوں کر بولتے ہیں ۱۲ ۲ نقاشِ ازل۔ خدا۔ قدرت ۱۲
۳ نقش کرنا۔ بنانا۔ تصویر کھینچنا۔ یہ فارسی کا ترجمہ ہے ۱۲ ۴ شمشیر (تلوار) کی تشبیہ ابرو سے
دی گئی ہے، مطلب یہ ہے کہ تیرے منھ پر ابرو کا بنانا گویا تلوار کھینچنا ہے ۱۲ ۵ سیل، بمعنی بہاؤ۔ پانی کا
ریلا۔ حوادث۔ حادثے کی جمع بمعنی انقلاب ۱۲ ۶ فکر کو اہل دہلی اکثر مذکر بولتے ہیں اور لکھنؤ میں
عموماً مونث ہے ۱۲ ۷ دردسر دینا۔ حیران کرنا۔ یہ بھی فارسی کا ترجمہ ہے، اب اس طرح نہیں بولتے ہیں ۱۲
۸ ناقباحت فہم، بمعنی بری عقل والا۔ بری سمجھ والا ۱۲ ۹ سر رشتہ۔ سلسلہ۔ معاملہ۔ پایا جاتا
متروک زبان ہے۔ اب پایا جاتا ہے فصیح ہے ۱۲

اپنے ہی دل کی نہ ہو واشد[1] تو کیا حاصل نسیم! گو چمن میں غنچۂ پژمردہ مجھ سے کھل گیا
رشک کی جاگہ[2] ہے مرگ اس کشتۂ حسرت کی میر
نعش کے ہمراہ جس کی گور تک قاتل گیا

(۵) ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل[3] اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا
(۶) ہاتھ سے تیرے اگر میں ناتواں مارا گیا سب کہیں گے یہ کہ کیا اک نیم جاں مارا گیا
اک نگہ سے بیش کچھ نقصان نہ آیا اس کے تئیں اور میں بے چارہ تو اے مہرباں مارا گیا
وصل و ہجراں سے جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا
جس نے سر کھینچا دیارِ عشق میں اے بوالہوس وہ سراپا آرزو آخر جواں مارا گیا

(۷) شہرۂ عالم اسے یُمنِ[4] محبت نے کیا ورنہ مجنوں ایک خاکِ افتادۂ ویرانہ تھا
اک نگاہِ آشنا[5] کو بھی وفا کرتا نہیں وا[6] ہوئی مژگاں کہ سبزۂ[7] بیگانہ تھا
روز و شب گزرے ہی پیچ و تاب میں رہتے تجھے اے دلِ صد چاک کس کی زلف کا تو شانہ[8] تھا
یاد آتا ہے کہ اپنے روز و شب کی جائے باش[9] یا درِ باز[10] بیاباں یا درِ مے خانہ تھا

---

[1] واشد۔ شگفتگی۔ کھلنا ۱۲ [2] جاگہ اب نہیں بولتے۔ جگہ بولتے ہیں۔ اگرچہ جائے گہ فارسی لفظ ہی مگر اردو میں مخفف ہو کر جگہ ہی فصیح ہی ۱۲ [3] اس شعر کا مطلب یہ ہی کہ دیر و حرم کی راہ چلنے سے دو عملی میں پھنس گیا۔ شیخ کا دعویٰ ہی کہ یہ میرا ہی۔ برہمن کہتا ہی کہ میرا۔ اگر ان دونوں مقامات سے تعلق نہ رہتا تو ایسے جھگڑے اور دعوے کیوں ہوتے ۱۲ [4] یُمن۔ بمعنی برکت ۱۲ [5] اک نگاہِ آشنا۔ یعنی ایک لمحہ ۱۲ [6] وا ہونا۔ کھلنا۔ مگر یہاں مژگاں کی وجہ سے اٹھنے کا مفہوم ہی ۱۲ [7] سبزۂ بیگانہ اس گھاس کو کہتے ہیں جو صحن چمن سے چھیل کر پھینک دی جاتی ہی ۱۲ [8] شانہ۔ کنگھی ۱۲ [9] جائے باش۔ رہنے کی جگہ ۱۲ [10] درِ باز۔ کھلا ہوا دروازہ ۱۲

غیر کے کہنے سے مارا اُن نے ہم کو بے گناہ — یہ نہ سمجھا وہ کہ واقع میں بھی تھا کچھ یا نہ تھا
شب فروغِ بزم کا باعث ہوا تھا حسنِ دوست — شمع کا جلوہ غبارِ دیدۂ پروانہ تھا

(۸)
بزمِ عشرت میں ملامت ہم نگوں[1] بختوں کے تئیں — جوں حباب[2] بادہ ساغر سرنگوں[3] ہو جاے گا

(۹)
عشق نے کیا کیا تصرّف[4] یاں کئے ہیں آج کل — چشم کو پانی کیا سب دل کو سب لوہو[5] کیا
کام میں قدرت کے کچھ بولا نہیں جاتا ہے ہائے — خوب رو اُس کو کیا لیکن بہت بدخو کیا

(۱۰)
دل کو گُل کہتے تھے درد و غم سے مرجھایا گیا — جی کو مہماں سنتے تھے، مہمان سا آیا گیا
جستجو میں یہ تعب[6] کھینچے کہ آخر ہو گئے — ہم تو کھوئے بھی گئے لیکن نہ کچھ پایا گیا

(۱۱)
ہر ورق، ہر صفحے میں اک شعر شور انگیز ہے — عرصۂ محشر کا عرصہ[7] ہے مرے دیوان کا

پانچواں وزن

بحر تقارب یا متقارب ۸ رکنی نمبر (۲) = فعولن فعولن فعولن فعول یا فعل،

(۱)

کہا میں نے[8] کتنا ہے گل کا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک[9] — پلک تک گیا تو تلاطم کیا

---

[1] نگوں بخت، اوندھی تقدیر والا ۱۲ [2] حباب کی ح کو زبر (فتحہ) ہے پیش غلط ہے اور بادہ بمعنی شراب ۱۲ [3] سرنگوں، اوندھا ۱۲ [4] تصرّف، ادل بدل۔ تغیر و تبدل ۱۲ [5] لوہو پرانی زبان ہے اب لہو کہتے ہیں ۱۲ [6] تعب، رنج، تکلیف، زحمت ۱۲ [7] عرصہ بمعنی میدان ۱۲ [8] کہا میں نے یعنی میں نے پوچھا کہ پھول کو دنیائے حیات میں کتنا ثبات حاصل ہے تو یہ سن کر کلی نے ہنس دیا۔ مدعا یہ کہ کلی کا ہنسنا (کھل جانا) پھول بن جانا ہے جس کے بعد اس کے مرجھانے کا زمانہ آجاتا ہے ۱۲ [9] سرشک بمعنی اشک۔ آنسو ۱۲

(۲)

کبھی اُس کی جو میں جتانے لگا — مجھے سیدھیاں[1] وہ سنانے لگا
تحمل نہ تھا جس کو ٹک سو وہ میں — ستم کیسے کیسے اُٹھانے لگا
پریشاں ہیں اس وقت میں نیک و بد — مُوا[2] جو کوئی وہ ٹھکانے لگا
نہیں رہتے عاقل علاقے[3] بغیر
کہیں میرے دل کو دوانے[4] لگا

(۳)

کوئی سادہ ہی اس کو سادہ[5] کہے — لگے ہے وہ ہم کو تو عیّار سا
محبّت ہے یا کوئی جی کا ہے روگ — سدا میں تو رہتا ہوں بیمار سا
مگر آنکھیں تیری بھی چپکی[6] کہیں — ٹپکتا ہے چتون سے کچھ پیار سا

(۴)

پریشاں ہوا دوستی کرکے میں — بہت محکوار مان تھا چاہ کا
اسیری کا دیتا ہے مژدہ مجھے — مرا زمزمہ گاہ بے گاہ[7] کا

(۵)

تجاہل[8]، تغافل، تساہل[9] کیا — ہوا کام مشکل توکّل[10] کیا
نہیں تاب لاتا دلِ زار اب — بہت ہم نے صبر و تحمل کیا
زمینِ غزل ملک سی ہو گئی — یہ قطعہ تصرّف[11] میں بالکل کیا
حقیقت نہ میری اپنی سمجھی گئی — شب و روز ہم نے تامّل[12] کیا

---

[1] سیدھیاں سنانا، اُردو کا محاورہ ہے یعنی بُرا بھلا کہنا ۱۲ [2] مُوا، یعنی مر گیا۔ اب نہیں بولتے ۱۲
[3] علاقے بغیر یعنی بغیر تعلق کے ۱۲ [4] دِوانے دیوانے کی جگہ قدما بولتے تھے اب کوئی نہیں بولتا ۱۲
[5] سادہ۔ سیدھا سادا۔ بے وقوف ۱۲ [6] آنکھیں چپکنا، یعنی آنکھ لڑنا۔ عاشق و فریفتہ ہونا ۱۲
[7] گاہ بے گاہ۔ کبھی کبھی ۱۲ [8] تجاہل۔ انجان بننا ۱۲ [9] تساہل، سہل جاننا۔ سہل انگاری ۱۲ [10] توکّل
اللہ پر بھروسا کرنا ۱۲ [11] تصرّف، یہاں قابو اور قبضے کے معنی میں ہے ۱۲ [12] تامّل۔ غور و فکر ۱۲

(۶)

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
میں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے — جسے ابر ہر سال روتا رہے گا
مجھے کام رونے سے اکثر ہی ناصح! — تو کب تک مرے منھ کو دھوتا رہے گا
بس اے گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ہیں — جہاں کو کہاں تک ڈبوتا[۱] رہے گا
مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے — جرس[۲] کا بھی جو ہوش کھوتا رہے گا
تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے — ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا[۳] رہے گا

بس اے میرؔ مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

چھٹا وزن

بحر متدارک ۱۶ رکنی نمبر (۷) = فَعْلُن فَعْلُن فَعْلُن فَعْلُن فَعْلُن فَعْلُن فع یا فاع

(۱)

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند — یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

---

۱ "ڈبونا" کا تلفظ واو سے فصیح ہے۔ عام طور سے ڈبانا بولا جاتا ہے وہ اہلِ زبان کے نزدیک فصیح نہیں ۱۲ ۲ جرس گھنٹا جو قافلے کی روانگی کے وقت بجایا جاتا ہے ۱۲ ۳ ہوتا رہے گا۔ اردو کا محاورہ ہے جو برا کہنے کے موقع پر جواب میں کہا جاتا ہے، یعنی ہمیں برا کہے گا تو تو ہی جانے گا۔ تو ہی برا سنے گا ۱۲

ناحق[1] ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا احرام — کوچے کے اُس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے — رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو، اُن نے تو
قشقہ[2] کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

(۲) خوب کیا جو اہلِ کرم کے جود[3] کا کچھ نہ خیال کیا — ہم جو فقیر ہوئے تو ہم نے پہلے ترک سوال کیا

(۳) دُور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں[4] کا — وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

(۴) عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب[5] گئی آرام گیا — جی کا جانا ٹھیر[6] رہا ہے صبح گیا یا شام گیا

عشق کیا، سر دین گیا، ایمان گیا اسلام گیا — دل نے ایسا کام کیا کچھ جس سے میں ناکام گیا

ہائے جوانی، کیا کیا کہیے، شور سروں میں رکھتے تھے — اب کیا ہے وہ عہد گیا وہ موسم وہ ہنگام گیا

---

[1] متکلمین اسلام میں ایک گروہ ایسے عقائد رکھتا ہے جس کا خیال ہے کہ انسان مجبور محض ہے۔ جو کچھ بھی اچھا بُرا عمل ہوتا ہے وہ قدرت کی مختاری سے ہوتا ہے، اس لئے انسان کسی فعل کا ذمہ دار نہیں۔ اس مذہب کو جبریہ کہتے ہیں، اسی خیال کے مطابق یہ شعر کہا گیا ہے کہ ہم مجبور ہیں کوئی کام اپنے اختیار سے نہیں کرتے اس لئے کسی گناہ کی تہمت اور الزام ناحق ہے۔ کریں ہیں پرانی زبان ہے۔ اب "کرتے ہیں" فصیح ہے ۱۲ [2] قشقہ، صندل یا سیندور وغیرہ کا وہ ٹیکا ہوتا ہے جو برہمن اور دیگر ہنود ماتھے پر کھینچتے ہیں اور یہ اُن کا شعار مذہبی ہے ۱۲ [3] جود بمعنی سخاوت، داد و دہش ۱۲ [4] غزال بمعنی ہرن ۱۲ [5] خواب کو اب متفق علیہ سب مذکر بولتے ہیں ۱۲ [6] ٹھیر کا یہ تلفظ پرانا ہے اب ٹھہر بغیر ی کے بروزن کمر۔ فصیح ہے ۱۲

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا (۵) درد آگیں انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رووے گا
چشمِ تماشا وا ہووے تو دیکھا بھالی غنیمت ہے مت موندے[1] آنکھوں کو غافل دیر تلک پھر سووے گا
جست[2] و جو بھی اُس کی کرے[3] جس کا نشاں کچھ پیدا ہو
پانا اُس کا میرؔ ہے مشکل جی تو یوں ہی کھووے[4] گا
باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا (۶) پڑھتے کسو کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا
سعی و تلاش بہت سی رہے گی اس انداز سے کہنے کی صحبت میں علما و فضلا کی جا کر پڑھئے گنئے گا

ساتواں وزن

بحرِ مُجتَث، ۸ رکنی نمبر (۱) = مفاعلن فَعِلاتن مفاعِلن فعلن، یا فَعْلن یا فَعِلان یا فعْلان۔

چمن میں گل نے جو کل دعویِ جمال کیا (۱) جمالِ یار نے منھ اُس کا خوب لال کیا
بہارِ رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو چمن کو یمنِ قدم نے ترے نہال[5] کیا
لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میرؔ کا اس عاشقی نے حال کیا

---

[1] موندنا - بند کرنے کے معنی میں - اب متروک الاستعمال ہے ۱۲ [2] جست و جو کا یہ تلفظ یعنی ت کے پیش کو کھینچ کر متروک ہے - معمولی پیش کے ساتھ (جُستجو) بولتے ہیں ۱۲ [3] کرئیے بھی پرانی زبان ہے - اب کیجیے فصیح ہے ۱۲ [4] کھووے گا، رووے گا، سووے گا وغیرہ یہ سب بغیر دوسرے واو کے اب بولے جاتے ہیں یعنی کھوئے گا - سوئے گا وغیرہ ۱۲ [5] نہال کرنا بمعنی خوش کرنا، اور نہال کے معنی درخت کے بھی ہیں ۱۲

(۲)
ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں — تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میرؔ
پہ[1] میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

(۳)
ملا ہی خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں — نکل کے شہر سے ٹک سیر[2] کر مزاروں کا
تڑپ کے مرنے سے دل کے کہ مغفرت ہو اُسے[3] — جہاں میں کچھ تو رہا نام بے قراروں کا
تڑپ کے خرمنِ گل پر کہیں گر، اے بجلی — جلانا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا
تمھیں تو زہد و ورع[4] پر بہت ہے اپنے غرور — خدا ہے شیخ جی ہم بھی[5] گناہگاروں کا

(۴)
دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا — جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا
اگرچہ عمر کے دس[6] دن بھی لب رہے خاموش — سخن رہے گا سدا میری کم زبانی کا
ہزار جان سے قربان بے پری کے ہیں — خیال بھی کبھی گزرا نہ پرفشانی[7] کا

لے پہ - پر کی جگہ بمعنی لیکن اور مگر ہے - اب یہ بھی بہت کم فصحا بولتے ہیں اور یہ تو بالکل متروک ہے ۱۲
ے۲ سیر - مونث ہے مگر سو دو سو برس پہلے کوئی خاص التزام نہ تھا اور اکثر قدما مذکر کو مونث اور مونث لفظ کو مذکر بول جاتے تھے ۱۲ ے۳ مغفرت ہو اُسے - یعنی خدا اُس کو بخشے - یہ پرانی ترکیب ہے - اب یوں کہتے ہیں کہ اُس کی مغفرت ہو ۱۲ ے۴ ورع - بمعنی پارسائی ۱۲ ے۵ یہاں لفظ بھی بطور تعقید واقع ہوا ہے - دراصل گناہگاروں کا بھی ہے - مگر نظم کی مجبوری سے بعض استعمال اس طرح ہو جاتے ہیں، جو فصیح نہیں ۱۲ ے۶ عمر کی ناپائداری کو دیکھتے ہوئے دنیا کے قیام کو بہت کم اور بے اعتبار مانا جاتا ہے - اسی کمی کے اظہار کے لئے، عمر دو روزہ - یا دس دن کہتے ہیں ۱۲ ے۷ پرفشانی - اُڑنے سے مراد ہے - یہ قاعدہ ہے کہ جانور جب اُڑتا ہے تو پہلے پر جھاڑتا ہے اسی کو پرفشانی کہتے ہیں ۱۲

نمود کر کے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا　　کہے تو میرؔ بھی اک بُلبلا تھا پانی کا

(۵)

قطعہ

بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا　　وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا
وہ دل، کہ شام و سحر جیسے پکّا پھوڑا تھا　　وہ دل کہ جس سے ہمیشہ جگر فگار رہا
تمام عمر کٹی اُس پہ ہاتھ رکھتے ہمیں[۱]　　وہ دردناک علی الرّغم[۲] بے قرار رہا
ستم میں، غم میں، سرانجام اُس کا کیا کہئے　　ہزاروں حسرتیں تھیں تس[۳] پہ جی کو مار رہا
بہا تو خون ہو[۴] آنکھوں کی راہ بہہ نکلا　　رہا جو سینۂ سوزاں میں داغ دار رہا
سو اُس کو ہم سے فراموش کاریوں لے گئے　　کہ اُس سے قطرۂ خوں بھی نہ یادگار رہا

گلی میں اُس کی گیا سو گیا نہ بولا پھر
میں میرؔ میر[۵] کر اُس کو بہت پکار رہا

(۶)

رہِ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی　　شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

---

[۱] ہاتھ رکھتے، یعنی تسکین دیتے ہوئے ۱۲ [۲] علی الرّغم - برخلاف - برعکس ۱۲ [۳] تس پہ، بہت پُرانی بولی ہے - اب نہیں بولتے - اس کی جگہ اُس پر بولتے ہیں ۱۲ [۴] ہو - بجائے ہوکر - اُردو میں امر کے دو صیغے ملاکر ایک فعل بنایا جاتا ہے جیسے مار کر - رو کر - بیٹھ کر وغیرہ مگر پُرانے لوگ اس موقع پر اکثر ایک ہی صیغۂ امر بولتے تھے جو فی زمانا متروک ہے ۱۲
[۵] میر میر کر، یعنی میر میر کہکر - میر کا نام لے کر ۱۲

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن (۷) رہے ہے[1] خوف مجھے واں کی بے نیازی کا
کسو کی بات نے آگے مرے نہ پایا رنگ دلوں میں نقش ہے میری سخن طرازی کا
بسانِ[2] خاک ہو پامالِ راہِ خلق اے میرؔ
رکھے ہے دل میں اگر قصد سرفرازی کا

شریفِ مکّہ[3] رہا ہے تمام عمر اے شیخ (۸) یہ میرؔ اب جو گدا ہے شراب خانے کا
جہاں کو فتنے سے خالی کبھو نہیں پایا (۹) ہمارے وقت میں تو آفتِ زمانہ ہوا
خلش نہیں کسو خواہش کی رات سے شاید سرشکِ یاس کے پردے میں دل روانہ ہوا
کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اُس کے میرؔ سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا

آٹھواں وزن

بحرِ خفیف ۶ - رکنی نمبر (۱) فاعلاتن مفاعلن فعِلن یا فعلات یا فعلن یا فعلان

(۱)

مُنھ تکا ہی کرے ہے جس تس[4] کا حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
شام[5] سے کچھ بجھا سا رہتا ہے دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

[1] رہے ہے، پرانی زبان ہے۔ اب رہتا ہے بولتے ہیں ۱۲ [2] بساں مثل ۔ مانند ۱۲
[3] شریف مکّہ ۔ والی مکّہ ۔ حاکم مکّہ ۱۲ [4] "جس تس" کا یعنی اس اُس کا ۱۲ [5] چوں کہ عموماً غریب و مفلس کے پاس تیل کم ہوتا ہے اس لئے اس کا چراغ جلد بجھ جاتا ہے، یہی مفہوم اس شعر میں ادا کیا گیا ہے

تھے بُرے مُغ بچوں[1] کے تیور لیک[2] | شیخ مے خانے سے بھلا کھسکا
فیض اے ابر چشمِ تر سے اُٹھا | آج دامن وسیع ہے اس کا

تاب کس کو جو حالِ میرؔ سُنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

(۲)

گُل کو محبوب میں قیاس کیا | فرق نکلا بہت جو باس[3] کیا
دل نے ہم کو مثالِ آئینہ | ایک عالم کا روشناس کیا
کچھ نہیں سوجھتا ہمیں اُس بن | شوق نے ہم کو بےحواس کیا
صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی | کیا پتنگے نے التماس[4] کیا

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں[5]
میرؔ کو تم عبث اُداس کیا

(۳)

دل سے شوقِ رُخِ نکو نہ گیا | جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا
ہر قدم پر تھی اُس کی منزل لیک | سر سے سودائے جستجو نہ گیا

۱؎ مُغ دراصل، آتش پرست کے پیر و مرشد کو کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سرداری سے، ساقی کو بھی کہنے لگے۔ مغاں کا واحد یا مخفف ہے۔ مغ بچے، اطفال مے خانہ، ساقی کے خدمتی و ماتحت میخوار ۱۲ ۲؎ لیک، لیکن کا مخفف، اب یہ لفظ اُردو میں فصیح نہیں ۱۲ ۳؎ باس کرنا۔ سونگھنا اب نہیں بولتے ۱۲ ۴؎ التماس، التماس اہل دہلی کے استعمال میں بحالت تذکیر ہے۔ خصوصاً شعرا مذکر ہی لکھتے ہیں۔ آج کل جن کو اتباع شعرا کا خیال نہیں وہ مونث بول جاتے ہیں ۱۲
۵؎ خوباں، یعنی حسین۔ خوبصورت۔ دوسرے مصرع میں تم اداس کیا کی جگہ آج کل "تم نے اُداس کیا" بولیں گے۔ قدیم شعرا (میر و سودا تک) اکثر علامت فاعلی (نے) کو حذف کر دیا کرتے تھے ۱۲

سب گئے، ہوش و صبر و تاب و تواں | لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا

دل میں کتنے مسوّدے[1] تھے ولے | ایک پیش اُس کے روبرو نہ گیا

سُبحہ[2] گرداں ہی میرؔ ہم تو رہے
دستِ کوتاہ تا سبو[3] نہ گیا

(۴)

دشمنی ہم سے کی زمانے نے | جو[4] جفا کار تجھ سا یار کیا

یہ توہّم[5] کا کارخانہ ہے | یاں وہی ہے جو اعتبار[6] کیا

صد رگِ جاں کو تاب دے[7] باہم | تیری زلفوں کا ایک تار کیا

ہم فقیروں سے بے ادائی[8] کیا | آن بیٹھے جو تم نے پیار[9] کیا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہب عشق اختیار کیا

---

۱ عربی کا لفظ مسوَّدَہ (بہ تشدید دال) لکھے ہوئے اور سیاہ کے معنی میں ہے۔ مگر اُردو میں واو کی تشدید سے بمعنی خیالات مضمون اور (Rough copy) رف کاپی کے بولا جاتا ہے۔ مسودہ بغیر تشدید اور کسرۂ واو غلط استعمال ہے ۱۲ ۲ سُبحہ۔ بضم سین، بمعنی تسبیح ۱۲ ۳ سُبو۔ بضم سین۔ ظرفِ شراب، ٹھلیا۔ گھڑا ۱۲ ۴ جو۔ اُردو میں یہ حرف چند موقعوں پر مستعمل ہوتا ہے۔ کبھی اسم موصول۔ بمعنی ہر شخص۔ جیسے جو چاہے آئے۔ کبھی حرف شرط بجائے اگر۔ بالفرض وغیرہ۔ یہاں کاف بیانیہ، یا "چوں کہ" کا ہم معنی ہے۔ مگر یہ استعمال پُرانی بول چال کے مطابق ہے۔ اب قریب قریب متروک سا ہے ۱۲ ۵ توہّم۔ وہم و خیال ۱۲ ۶ اعتبار کرنا۔ مان لینا۔ فرض کر لینا۔ قیاس کر لینا ۱۲ ۷ باہم تاب دے کر۔ یعنی بٹ کر ۱۲ ۸ بے ادائی۔ بمعنی بے رخی بے توجہی ۱۲ ۹ پیار کرنا۔ اخلاص کرنا، ربط بڑھانا۔ آن بیٹھنا۔ اب متروک ہے۔ آ بیٹھنا فصیح ہے۔

(۵)

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن
جب وہ آتا ہی تب نہیں آتا

صبر تھا ایک مونسِ ہجراں
سو[۱] وہ مدت سے اب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

عشق کو حوصلہ ہی شرط۔ ارنہ[۲]
بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

جی میں کیا کیا ہی اپنے اے ہمدم
پر سخن تا بہ لب نہیں آتا

(۶)

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ[۳] دل
سارے عالم کو میں دکھا لایا

دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہی بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا

سب[۴] پہ جس بار نے گرانی کی
اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

دل مجھے اُس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں ملا لایا

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

اب تو جاتے ہیں بُت کدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

---

[۱] اُردو میں "سو" کبھی ربطِ کلام کے لئے زائد بھی آتا ہی جیسا کہ اس مصرع میں ہی ۱۲ [۲] ارنہ درصل ورنہ ہی اور یہ فارسی کا استعمال ہی۔ قدیم شعرا اکثر فارسی کے استعمالات روا رکھتے تھے۔ اب یہ عمل جائز نہیں ۱۲ [۳] متاع یعنی سرمایہ، پونجی ۱۲ [۴] یہ شعر قرآن مجید کی ایک آیت شریف کا ترجمہ ہی۔ ارشاد ہوا ہی۔ اللہ نے اپنی امانت یعنی خلافت کا بار تمام کائنات کے سامنے پیش فرمایا، مگر آسمان، زمین اور پہاڑ سب نے اُس بارِ امانت کے اُٹھانے سے انکار کر دیا مگر انسان نے اُسے اُٹھا لیا (سورۂ احزاب رکوع آخر آیت ۷۲)

(۷)

سب سے مل جل کہ حادثہ[۱] ہے پھر — کہیں ڈھونڈھے بھی تو نہ پائیے گا
کہیے گا اُس سے قصۂ مجنوں — یعنی پردے میں غم سنائیے گا

قطعہ

شرکتِ شیخ و برہمن سے میرؔ — کعبہ و دیر سے بھی جائیے گا
اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدی[۲] مسجد — کسی ویرانے میں بنائیے گا

(۸)

سرسری[۳] تم جہان سے گزرے — ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم — یہ ہمارا بھی نازپرور[۴] تھا
بارے[۵] سجدہ ادا کیا تہِ تیغ — کب سے یہ بوجھ میرے سر پر تھا
اب خرابہ[۶] ہوا جہان آباد — ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

قطعہ

بے زری کا نہ کر گلہ غافل — رہ تسلی[۷] کہ یوں مقدر تھا
اتنے منعم جہان میں گزرے — وقتِ رخصت کسی کنے[۸] زر تھا
صاحبِ جاہ و شوکت و اقبال — یک ازاں جملہ اب سکندر تھا

۱؎ حادثہ، تغیر و انقلاب۔ واقعہ۔ سانحہ۔ یہاں حادثے سے مرجانا مراد ہے ۱۲ ۲؎ جُدی، پرانی زبان ہے جس کا استعمال مونث الفاظ کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ مگر اب خواہ لفظ مونث ہو یا مذکر ہر حالت میں جُدا بولتے ہیں۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا۔ اردو کا محاورہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ سب سے الگ رہ کر اپنا کام کرنا ۱۲ ۳؎ سرسری، یعنی گزران، جلدی، رواروی ۱۲ ۴؎ نازپرور، نازوں کا پالا ہوا عزیز ۱۲ ۵؎ بارے بمعنی بالآخر۔ آخرکار ۱۲ ۶؎ خرابہ، ویران، برباد ۱۲ ۷؎ رہ تسلی پرانی بول چال ہے۔ اب تسلی سے رہیں گے ۱۲ ۸؎ کنے بھی پاس کے معنی میں پرانی زبان ہے ۱۲

تھی یہ سب کائنات زیرِ نگیں — ساتھ مور[۱] و ملخ کا لشکر تھا
لعل و یاقوت دہم زر و گوہر — چاہیئے جس قدر میسّر تھا
آخرِ کار جب جہاں سے گیا — ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا
عیبِ[۲] طولِ کلام مت کر تو — کیا کروں میں سخن سے خوگر تھا

خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میرؔ معلوم ہے قلندر[۳] تھا

(۹)

کل چمن میں گل و سمن[۴] دیکھا — آج دیکھا تو باغ بن دیکھا
کیا ہے گلشن میں جو قفس میں نہیں — عاشقوں کو جلا وطن دیکھا
ذوقِ پیکان و تیر میں تیرے — مدتوں تک جگر نے چھن دیکھا
ایک چشمک[۵]، دو صد سنانِ[۶] مژہ — اُس نکیلے کا بانکپن دیکھا
حسرت اُس کی جگہ تھی خوابیدہ[۷] — میرؔ کا کھول کر کفن دیکھا

(۱۰)

قطعہ

سعیِ[۸] طوف و حرم نہ کی ہرگز — آستاں پر ترے مقام کیا

۱؎ مور بمعنی چیونٹی۔ ملخ بمعنی ٹڈی ۱۲ ۲؎ عیبِ طولِ کلام۔ یعنی زیادہ گوئی کا الزام ۱۲
۳؎ قلندر۔ آزاد فقیر۔ بے پروا اور بے قید ہستی جن کو دنیا و ما فیہا کی فکر نہیں رہتی ۱۲
۴؎ سمن بمعنی چمیلی، گُل عام پھولوں کے علاوہ مخصوص گلاب کے پھول کو کہتے ہیں ۱۲ ۵؎ چشمک، آنکھ کا اشارہ، ۶؎ سناں برچھی، بھالا ۱۲ ۷؎ خوابیدہ سوئی ہوئی ۱۲ ۸؎ سعی، کوشش کے معنی کے سوا حج کے مناسک و مراسم میں طواف کے بعد صفا و مروہ (خانہ کعبہ کے پاس دو پہاڑ ہیں) کے درمیان دوڑنے کو بھی کہتے ہیں اور یہاں یہی مراد ہے ۱۲

تیرے کوچے کے رہنے والوں نے | یہیں سے کعبے کو سلام کیا
عشقِ خوباں کو میرؔ میں اپنا | قبلہ و کعبہ و امام کیا

(۱۱)

حیرتِ روئے گُل سے مرغِ چمن | چپ ہی یوں بے زبان ہی گویا
مسجد ایسی بھری بھری کیا ہی | میکدہ اک جہان ہی گویا
وہی شور و مزاج شیب[۱] میں ہی
میرؔ اب تک جوان ہی گویا

(۱۲)

اک نگہ، ایک چشمک، ایک سخن | اس میں بھی تم کو ہی تامّل سا
بارے مستوں نے ہوشیاری کی | دے کے کچھ محتسب[۲] کا مُنھ جھلسا

(۱۳)

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو | دیر سے انتظار ہی اپنا
روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات | اب یہی روزگار[۳] ہی اپنا
دے کے دل ہم جو ہو گئے مجبور | اس میں کیا اختیار ہی اپنا
کچھ نہیں ہی مثالِ عنقا، لیک | شہر شہر اشتہار ہی اپنا
جس کو تم آسمان کہتے ہو | سو دلوں کا غبار ہی اپنا

(۱۴)

وائے احوال اُس جفاکش کا | عاشق اپنا جسے وہ جان گیا

۱؎ شیب بروزن سیب، بڑھاپا بال سفید ہونے کا زمانہ ۱۲ ۲؎ محتسب، وہ حاکم جو خلاف شرع باتوں کا نگراں ہو۔ قاضی مفتی ۱۲ ۳؎ روزگار بمعنی مشغلہ۔ دھندا۔ حالت، عالم ۱۲

داغِ حرماں[1] ہے خاک میں بھی ساتھ ۔۔۔ جی گیا پر نہ یہ نشان گیا
کل نہ آنے میں ایک یاں تیرے ۔۔۔ آج سو سو طرف گمان گیا
دل سے مت جا کہ پھر وہ پچتایا ۔۔۔ ہاتھ سے جس کے یہ مکان گیا
کون جی سے نہ جائے گا اے میرؔ
حیف یہ ہے کہ تو جوان گیا

(۱۵)
چشم سے خوں ہزار نکلے گا ۔۔۔ کوئی[2] دل سے غبار نکلے گا؟

(۱۶)
دل نے کیا کیا نہ درد ذات دیئے ۔۔۔ جیسے پکتا رہے کوئی پھوڑا
کیا کرے سخت مدعی تھے بلند ۔۔۔ کوہکن نے تو سر بہت پھوڑا
دل ہی مرغِ چمن کا ٹوٹ گیا ۔۔۔ پھول گل چیں نے ہائے کیوں توڑا
ہے لبِ بام[3] آفتابِ عمر
گریئے[4] سو گیا، ہے میرؔ دن تھوڑا

(۱۷)
رفتۂ[5] عشق کیا ہوں میں اب کا ۔۔۔ جا چکا ہوں جہان سے کب کا
لوگ جب ذکرِ یار کرتے ہیں ۔۔۔ دیکھ رہتا ہوں میں منھ سب کا
مست رہتا ہوں جب سے ہوش آیا ۔۔۔ میں بھی عاشق ہوں اپنے مشرب[6] کا

۱؎ حرماں بمعنی اندوہ وغم ۱۲ ۲؎ یہ مصرع بطور انکار استفہامی کہا گیا ہے یعنی دل سے غبار نہ نکلے گا ۱۲
۳؎ آفتابِ لبِ بام ۔ کنایہ ہے مرنے کے قریب ہونے سے ۱۲ ۴؎ گریئے سو گیا ۔ یہ اُنی طرزِ گفتار ہے ۔ اب کیا کیجئے فصیح ہے ۱۲ ۵؎ رفتۂ عشق یعنی وارفتۂ عشق محبت میں کھویا ہوا ۱۲
۶؎ مشرب ۔ طریقہ ۔ ڈھنگ ۔ مسلک ۱۲ ۔

وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا (۱۸) کیا جدائی کو منہ دکھاؤں گا

(۱۹)

اُس کی سی جو[1] چلے ہی راہ تو کیا — آسماں پر گیا ہی ماہ تو کیا
کب رُخ بدر روشن ایسا ہی — ایک شب کا ہی اشتباہ[2] تو کیا
بے خرد خانقہ میں ہیں گو مست — وہ کرے مست[3] اک نگاہ تو کیا
حسن والے ہیں کج روش سارے — ہوئے دو چار روبراہ[4] تو کیا

—— • ◦ • ◦ • ——

نواں وزن

بحرِ مضارع، ۸ رکنی، نمبر (۱) مفعولُ فاعلاتن مفعولُ فاعلاتن

(۱)

پودا ستم کا جس نے اس باغ میں لگایا — اپنے کیے کا ثمرہ اُس نے شتاب پایا
آباد جس میں تجکو دیکھا تھا ایک مدت — اُس دل کی مملکت[5] کو اب ہم خراب پایا[6]

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے
ہی خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

[1] جو، بمعنی اگر ۱۲ [2] اشتباہ، شبہ ہونا۔ مشابہت ۱۲ [3] یعنی وہ مست اگر ایک نگاہ دیکھ لے تو کیا کہنا ۱۲ [4] روبراہ۔ سیدھے۔ ٹھیک ٹھیک ۱۲ [5] مملکت۔ پہلا میم مفتوح (زبر) دوسرا ساکن۔ لام کو پیش۔ ت کو زبر (فتحہ) بمعنی سلطنت، بادشاہت۔ دارالسلطنت ۱۲
[6] ہم خراب پایا۔ پرانی زبان ہی۔ ہم نے خراب پایا فصیح ۱۲

(۲)

مانندِ شمعِ مجلس، شب اشک بار پایا — القصہ میرؔ کو ہم بے اختیار پایا

احوالِ خوش اُنھوں[1] کا ہم بزم ہیں جو تیرے — افسوس ہے کہ ہم نے واں کا نہ بار[2] پایا

شہرِ دل ایک مدت اُجڑا بسا غموں میں — آخر اُجاڑ دینا اس کا قرار پایا

اتنا نہ دل سے ملتے تا دل کو کھو کے روتے — جیسا کیا تھا ہم نے ویسا ہی یار پایا

کیا اعتبار یاں کا پھر اُس کو خوار دیکھا — جس نے جہاں میں آ کر کچھ اعتبار[3] پایا

آہوں کے شعلے جس جا اُٹھے ہیں میرؔ شب کو
واں جا کے صبح دیکھا مشتِ غبار پایا

یا روئے یا رُلایا اپنی تو یوں ہی گزری (۳) — کیا ذکر ہم صفیراں[4]! یارانِ شادماں کا

قیدِ قفس میں ہیں تو خدمت ہے نالگی[5] کی — گلشن میں تھے تو ہم کو منصب تھا روضہ خواں[6] کا

پوچھو تو میرؔ سے کیا کوئی نظر پڑا ہے
چہرہ اُترا رہا ہے کچھ آج اس جواں کا

وہ دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں[7] تھیں (۴) — سو کھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبہ[8]

ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں[9] ہیں — نے عشق کو ہے صرفہ[10] نے حسن کو محابا[11]

---

[1] اُنھوں کا ۔ متروک، اُن کا مستعمل ۱۲ [2] بار پانا ۔ یعنی رسائی حاصل کرنا ۔ پہنچنا ۱۲ [3] اعتبار پانا ۔ اعزاز و جاہ یا شہرت یافتہ ہونا ۱۲ [4] اُردو میں ہم صفیراں، فارسی کی پرانی ترکیب ہے ۔ اب ہم صفیرو فصیح ہے ۱۲ [5] نالگی ۔ یعنی نالہ کرنا ۱۲ [6] روضہ خواں، اُس مرثیہ خواں یا قصیدہ خواں کو کہتے ہیں جب مجلسوں میں منبر پر بیٹھ کر کوئی نظم پڑھتا ہے ۱۲ [7] بہتیاں، پرانی زبان ہے، اب بہتی بولتے ہیں ۱۲ [8] دوآبہ، دو دریا، یا دونوں کا درمیانی حصہ ۱۲ [9] جاتیاں بھی بہتیاں کی طرح پرانی بولی ہے ۔ اب انھیں بولتے صرف جاتی فصیح ہے ۱۲ [10] صرفہ ۔ بمعنی بخل ۔ رکاوٹ ۔ تامل ۱۲ [11] محابا میم کے پیش سے ۔ تامل ۔ لحاظ ۱۲

(۵)

گلیوں میں اب تلک بھی مذکور ہی ہمارا
افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا

مقصود کو تو دیکھیں کب تک پہنچتے ہیں ہم
بالفعل اب ارادہ تاگورۓ[ا] ہے ہمارا

ہیں مشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میرؔ ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

(٦)

اپنے تڑپنے کی میں تدبیر پہلے کر لوں
تب فکر میں کروں گا زخموں کے بھی رفو کا

یہ عیش گہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے
ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا

بلبل غزل سرائی آگے ہمارے نت کر
سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا

(۷)

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا

دنیا و دیں کی جانب میلان ہو تو کہیے
کیا جانیے کہ اُس بن دل ہے کدھر ہمارا

جوںۓ[۲] صبح اب کہاں ہے طولِ سخن کی فرصت
قصہ ہی کوئی دم میں ہے مختصر ہمارا

کوچے میں اُس کے جاکر بنتا نہیں پھر آنا
خوں ایک دن گرے گا اس خاک پر ہمارا

ا گور کا تلفظ اُردو میں واو مجہول کے ساتھ بروزن ڈور۔ شور ہے۔ لیکن یہاں بروزن حُور واو معروف سے موزوں ہوا ہے۔ یہ استعمال قواعد فارسی کے مطابق ہے فصحائے حال اُردو میں اس کو ناجائز سمجھتے ہیں اور فن قافیہ میں اس عیب کا نام اقوا (بکسر اول) ہے ۱۲ ۲ جوں یا جیوں (بواو معروف) بمعنی مثل و مانند۔ اب متروک الاستعمال ہے۔ اس شعر میں اپنے وقت مختصر کی وقتِ سحر سے مثال دے کر کہا گیا ہے کہ صبح کا وقت جسقدر طول ہوتا ہے ہمارا زمانۂ حیات اتنا بھی نہیں بلکہ وہ ایک دم میں ختم ہوجاتا ہے

(۸)

ہر حرفِ غم نے میرے مجلس کے تئیں رُلایا — گویا غبارِ دل کا پڑھتا کتاب نکلا
آیا جو واقعے[1] میں درپیش عالمِ مرگ — یہ جاگنا ہمارا دیکھا تو خواب نکلا

(۹)

ماہیّتِ[2] دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے[3] — یک قطرہ خوں یہ دل کا طوفان ہے ہمارا
کیا خانداں کا اپنے تجھ سے کہیں تقدّس[4] — روح القدس[5] اک ادنیٰ دربان ہے ہمارا
کرتا ہے کام وہ دل جو عقل میں نہ آوے — گھر کا مُشیر[6] کتنا نادان ہے ہمارا

(۱۰)

سارے رئیسِ اعضا[7] ہیں معرضِ تلف[8] میں — یہ عشق بے مُحابا[9] کس کو امان دے گا
پائے پُر آبلہ سے میں گم شدہ گیا ہوں — ہر خار بادیے[10] کا میرا نشان دے گا
نالہ ہمارا ہر شب گزرے ہے آسمان سے — فریاد پر ہماری کس دن تو کان دے[11] گا

(۱۱)

ہوش اُڑ گئے سبھوں کے شورِ سحر سے اُس کے — مرغِ چمن اگرچہ یک مشتِ بال و پر تھا
پھر آج یہ کہانی کل شب پہ رہ گئی ہے — سوتا نہ رہتا ٹک تو قصہ ہی مختصر تھا

---

[1] واقعہ، بمعنی خواب ۱۲ [2] ماہیّت، صحیح ی کی تشدید سے ہے مگر استعمال میں بغیر تشدید فصیح ہے بمعنی حقیقت ۱۲ [3] کھاتی پھرے ہے کی جگہ اب کھاتی پھرتی ہے فصیح ہے ۱۲ [4] تقدّس۔ پاکیزہ۔ متبرک ۱۲ [5] روح القدس دال کے پیش سے روح الامین (جبرئیل) کو کہتے ہیں ۱۲ [6] مُشیر، میم کے پیش سے بمعنی مشورہ دینے والا ۱۲ [7] رئیس اعضا، دل و دماغ سے مراد ہے۔ کہ تمام عضووں میں ممتاز ہیں ۱۲ [8] معرضِ تلف میں، یعنی مٹنے والے یا مٹنے کی حالت میں ۱۲ [9] بے مُحابا۔ بے پروا ۱۲ [10] بادیہ بمعنی صحرا۔ جنگل ۱۲ [11] کان دینا، توجہ کرنا۔ سُننا ۱۲

(۱۲)

پہلا قدم ہی انساں! پامالِ مرگ ہونا
کیا جانے رفتہ رفتہ کیا ہو مآل تیرا
کچھ زرد زرد چہرہ کچھ لاغری بدن میں
کیا عشق میں ہوا ہی اے میرؔ حال تیرا

(۱۳)

ابر، اور جوشِ گل ہی چل خانقہ سے صوفی!
ہی لطف مے کدے میں دہ چند اس ہوا کا

(۱۴)

یک وہم سی رہی ہی اپنی نمود تن میں[1]
آتے ہو اب تو آؤ پھر ہم میں کیا رہے گا
مذکورِ یار ہم سے مت ہم نشیں کیا کر
دل جو بجا نہیں ہی پھر اس میں جا رہے گا[2]

دسواں وزن

بحر ہزج، ۸- رکنی نمبر (۲) مفعولُ مفاعیلن مفعولُ مفاعیلن

(۱)

مر رہتے جو گل بن، تو سارا یہ خلل جاتا
نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا
ہیں گریۂ خونی کو رو کے ہی رہا ورنہ
اک دم میں زمانے کا یاں رنگ بدل جاتا
بن پوچھے کرم سے وہ جو بخش نہ دیتا تو
پرسش میں ہماری ہی دن حشر کا ڈھل جاتا

---

[1] یک کی جگہ اک بھی موزوں ہو سکتا ہی۔ مگر اس زمانے میں باتباع فارسی یہی زبان تھی ۱۲
[2] بجا نہ ہونا۔ یعنی ٹھکانے سے نہ ہونا۔ بے قابو ہونا ۱۲

(۲)

اے دوست کوئی مجھ سا رسوا نہ ہوا ہوگا
دشمن کے بھی دشمن پر ایسا نہ ہوا ہوگا

ٹک گورِ غریباں کی کر سیر کہ دنیا میں
ان ظلم رسیدوں پر کیا کیا نہ ہوا ہوگا

اس کہنہ خرابے میں آبادی نہ کر منعم
اک شہر نہیں یاں جو صحرا نہ ہوا ہوگا

آنکھوں سے تری ہم کو ہے چشم[۱] کہ اب ہووے
جو فتنہ کہ دنیا میں برپا نہ ہوا ہوگا

جزو مرتبۂ کل کو حاصل کرے ہے، آخر
یک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

(۳)

کیا کہیے کہ خوباں نے اب ہم میں ہے کیا رکھا
ان چشم سیاہوں نے بہتوں کو سلا رکھا

جلوہ ہے اُسی کا سب گلشن میں زمانے کے
گل پھول[۲] کو ہے اُن نے پروانہ بنا رکھا

جوں برگِ خزاں دیدہ سب[۳] زرد ہوئے ہم تو
گرمی نے ہمیں دل کی آخر کو جلا رکھا

(۴)

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

تھا ناز بہت ہم کو دانست پر اپنی بھی
آخر وہ بُرا نکلا ہم جس کو بھلا جانا

کیا پانی[۴] کے مول آکر مالک نے گہر بیچا
ہے سخت گراں سستا یوسف کا بکا جانا

اے شورِ قیامت! ہم سوتے ہی نہ رہ جاویں
اس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جانا

---

۱ چشم، بمعنی اُمید ۱۲ ۲ گل پھول کی جگہ اب گل بوٹا۔ یا غنچہ و گل بولتے ہیں ۱۲

۳ سب، بمعنی بالکل۔ از سرتاپا۔ اس معنی میں اب متروک ہے ۱۲

۴ پانی کے مول بکنا یا بیچنا۔ یعنی سستے داموں بیچنا۔ حضرت یوسف کا قصہ مشہور ہے کہ اُن کو مصر میں فروخت کیا گیا تھا ۱۲

(۵)

آنسو مری آنکھوں میں ہر دم جو نہ آجاتا ... تو کام مرا اچھا پردے میں چلا جاتا
کہتے تو ہو، یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا ... یہ کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا
گر عشق نہیں ہی تو یہ کیا ہی بھلا مجکو ... جی خود بخود اے ہمدم کاہے کو کھپا[۱] جاتا

(۶)

ہر آن تھی سرگوشی یا بات نہیں گاہے ... اوقات[۲] ہے اک یہ بھی اک وہ بھی زمانا تھا
پامالی عزیزوں کی رکھنی تھی نظر میں ٹک ... اتنا بھی تمھیں آکر یاں سر نہ اُٹھانا تھا
اک محو[۳] تماشا ہیں، اک گرم ہیں قصے کے ... یاں آج جو کچھ دیکھا سو کل وہ فسانا تھا
کیا مورتیں بگڑی ہیں مشتاقوں کی ہجراں میں ... اس چہرے کو اے خالق ایسا نہ بنانا تھا
مت سہل ہمیں سمجھو پہنچے ہیں بہم تب ہم ... برسوں تئیں گردوں نے جب خاک کو چھانا تھا

(۷)

دیکھا نہ ادھر ورنہ آتا نہ نظر ہی میں ... جی مفت مرا جاتا اُس شوخ کا کیا جاتا
تھا میر بھی دیوانہ پر ساتھ ظرافت کے ... ہم سلسلہ داروں[۴] کی زنجیر ہلا جاتا

(۸)

سر مارنا پتھر سے یا ٹکڑے جگر کرنا ... اس عشق کے وادی[۵] میں ہر نوع[۶] بسر کرنا

---

۱ کھپا جانا۔ مٹ جانا۔ سما جانا۔ ختم ہو جانا ۱۲ ۲ اوقات، وقت کی جمع ہی مگر یہاں بمعنی عہد اور زمانہ ہی ۱۲
۳ اس شعر میں اک کا لفظ چاہتا ہی کہ اس کے بعد ہی چاہیئے، یعنی اک محوِ تماشا ہی۔ مگر یہاں ہیں کہا گیا ہے اور یہی صحیح ہی مطلب یہ ہی کہ ایک طرح کے لوگ محو تماشا ہیں اور دوسری قسم کے لوگ قصہ کہنے میں سر گرم ہیں ۱۲
۴ سلسلہ بمعنی زنجیر سلسلہ دار۔ زنجیر میں جکڑے ہوئے قیدی ۱۲ ۵ وادی۔ بمعنی صحرا۔ جنگل یہ لفظ عموماً واقف کار شعرا کے کلام میں مذکر مستعمل ہی۔ مگر آج کل اکثر اہل قلم مونث بولنے لگے ہیں ۱۲
۶ ہر نوع۔ بہر حال۔ ہر طرح ۱۲

گیارہواں وزن

بحرِ کامل ۸، رکنی نمبر (۱) : متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن یا متفاعلان

(۱)

دمِ صبح بزمِ خوشِ جہاں شبِ غم سے کم نہ تھی مہرباں — کہ چراغ تھا سو وہ دود تھا جو پتنگ تھا سو غبار تھا
دلِ خستہ جو لہو ہو گیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک — کبھو سوزِ سینہ سے داغ تھا کبھو دردِ و غم سے فگار[1] تھا
دلِ مضطرب سے گزر گئی شبِ وصل اپنے ہی فکر میں — نہ دماغ تھا نہ فراغ تھا نہ شکیب[2] تھا نہ قرار تھا
یہ تمھاری ان دنوں دوستاں مژہ جس کے غم میں ہے خوں چکاں — وہی آفتِ دلِ عاشقاں کسو وقت ہم سے بھی یار[3] تھا
نہیں تازہ دل کی شکستگی یہی درد تھا یہی خستگی — اُسے جب سے شوقِ شکار تھا اسے زخم سے سروکار تھا
کبھی جائیو جو اُدھر صبا تو یہ کہیو اُس سے کہ بے وفا — مگر ایک میرِ شکستہ پا ترے باغِ تازہ میں خار تھا

بارہواں وزن

بحرِ ہزج ۶، رکنی نمبر (۶) : مفعولُ مفاعلن فعولن

(۱)

قطعہ

دنیا کی نہ کر تو خواستگاری — اس سے کبھو بہرہ ور نہ ہو گا
آ، خانہ خرابی اپنی مت کر — قحبہ[4] ہے یہ اس سے گھر نہ ہو گا

[1] فگار، بمعنی زخمی ۱۲ [2] شکیب، بمعنی تسکین و تسلی ۱۲ [3] ہم سے بھی یار تھا۔ پرانی زبان ہے۔ اب "ہمارا بھی یار تھا" کہیں گے ۱۲ [4] قحبہ بمعنی بدکار عورت، فاحشہ۔ درحقیقت دنیا وہی ہے جس میں بداعمالیاں ہوں یعنی کہ وہ بسلسلۂ انقلابات و تغیرات بدلتی رہتی ہے اور اس عمل کو بے وفائی سے مشابہت ہے اس بنا پر دنیا کو قحبہ کہا جاتا ہے کہ وہ کسی سے وفا نہیں کرتی ۱۲

(۲)

کچھ عشق و ہوس میں فرق بھی کر کیدھر ہے وہ امتیاز تیرا
کہتے نہ تھے میرؔ مت کڑھا کر دل ہو نہ گیا گداز[۱] تیرا

(۳)

شب کو وہ پیے شراب نکلا جانا کہ یہ آفتاب نکلا
قربانِ پیالۂ مئے ناب جس سے کہ ترا حجاب نکلا
مجھ بن جو پیا تھا قرط[۲] مے کا آنکھوں سے ہو خونِ ناب نکلا
مستی میں شراب کی جو دیکھا عالم یہ تمام خواب نکلا
شیخ آتے تو میکدے میں آیا پر ہو کے بہت خراب نکلا
یک جرعہ[۳] شراب ہی میں واعظ ہر مسخرگی[۴] کا باب نکلا
تھا غیرتِ بادہ عکسِ گل سے جس، جوئے[۵] چمن سے آب نکلا

تیرہواں وزن

بحر رمل، ۶ رکنی نمبر (۱۲) فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلات

(۱)

دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا رات کو سینہ بہت کوٹا گیا

---

۱ گداز، گداختن کا حاصل مصدر ہے۔ گداختن کے معنی پگھلنے اور گل جانے کے ہیں۔ یہاں تباہ و برباد ہو جانے سے مراد ہے ۱۲ ۲ قرط۔ بمعنی جرعہ۔ قطرہ۔ گھونٹ ۱۲ ۳ جرعہ، قطرہ گھونٹ ۱۲ ۴ مسخرگی۔ دل لگی۔ ظرافت ۱۲ ۵ جو۔ ندی۔ نہر ۱۲

میں نہ کہتا تھا کہ منھ کر دل کی اور — اب کہاں وہ آئینہ ٹوٹا گیا
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے — یہ نگر[۱] سو مرتبہ لوٹا گیا
میرؔ کس کو اب دماغِ گفتگو
عمر گزری ریختہ چھوٹا گیا

(۲)

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا
قافلے میں صبح کے اک شور ہے — یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں — تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا
یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں — داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا
غیرتِ یوسف[۲] ہے یہ وقتِ عزیز
میرؔ اس کو رائگاں کھوتا ہے کیا

(۳)

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا — دل کے جانے کا نہایت غم رہا
حسن تھا تیرا بہت عالم فریب — خط[۳] کے آنے پر بھی اک عالم رہا
جامۂ احرام[۴] زاہد پر نہ جا — تھا حرم[۵] میں لیک نامحرم رہا

۱؎ نگر۔ ہندی لفظ بمعنی آبادی بستی ۱۲ ۲؎ غیرتِ یوسف، یعنی رشکِ یوسف، یوسف کی طرح عزیز اور یوسف میں یہ نسبت اور مناسبت ہے کہ وہ مصر کے بادشاہ تھے اور مصر کے بادشاہ کا لقب عزیز ہوا کرتا تھا۔ اس صنعت کو رعایت لفظی کہتے ہیں ۱۲ ۳؎ خط، بمعنی سبزہ آغازی۔ مسیں بھیگنا ۱۲ ۴؎ جامۂ احرام، وہ بے سلا ہوا لباس (تہمد اور چادر) جو حج کے موقع پر حاجی باندھتے ہیں ۱۲ ۵؎ حرم خانہ کعبہ ۱۲

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبحِ پیری[1] شام ہونے آئی میرؔ
تو نہ چیتا[2] یاں بہت دن کم رہا

(۴)

حق تو سب کچھ ہی ہے تو ناحق نہ بول بات کہتے سر کٹا منصور[3] کا

بیچ سے[4] کب کا گیا اب ذکر کیا اُس دلِ مرحوم کا مغفور کا

قطعہ

مر گئے پر خاک ہے سب کبر و ناز مت جھکولو[5] سر کسی مغرور کا

ٹھیکری کی قدر ہے اس کی نہیں ٹوٹے جب کاسہ سرِ فغفور[6] کا

(۵)

دل کے خوں ہونے کا غم کیا اب سے تھا سینہ کوبی، سخت ماتم کب سے تھا



[1] پیری میں بال سفید ہو جاتے ہیں اور صبح کا رنگ بھی سفید ہوتا ہے اس لئے دونوں کو مشابہ کیا ہے اور پیری کے بعد مرنے کے سوا اور کوئی زمانہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اس زمانے کو شام سے استعارہ کیا ہے ۱۲ [2] چیتنا۔ چونکنا۔ ہوشیار ہونا ۱۲ [3] منصور، ایک بزرگ گزرے ہیں جنھوں نے بحالتِ جذب انا الحق کہدیا تھا جس پر علمائے ظاہر نے فتوائے کفر دے کر اُن کو سولی دلوا دی، اسی طرف اشارہ ہے ۱۲ [4] بیچ سے، پرانی زبان ہے اب درمیان سے کہتے ہیں ۱۲ [5] جھکولنا، ہلانا، دلانا۔ حرکت دینا۔ جھنجھوڑنا ۱۲ [6] فغفور، فغ بت کو کہتے ہیں اور فور، پور (بیٹا) کا معرب ہے بادشاہِ چین کا لقب

چودھواں وزن

بحر ہزج ۶ رکنی نمبر (۵) : مفاعیلن مفاعیلن فعولن

(۱)

گریباں سے رہا کوتہ تو پھر ہے — ہمارے ہاتھ میں دامن ہمارا
بلا جس چشم کو کہتے ہیں مردم — وہ ہے عینِ بلا مسکن ہمارا
ہوا رونے سے رازِ دوستی فاش — ہمارا گریہ تھا دشمن ہمارا
کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا — سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

(۲)

اسیرِ گہ عید میں دورِ سبو تھا — پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا
غلط تھا آپ سے غافل گزرنا[۱] — نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا
چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ — کہ ہر غنچہ دلِ پُر آرزو تھا
گل و آئینہ کیا؟ خرشید و مہ کیا؟ — جدھر دیکھا تدھر[۲] تیرا ہی رُو[۳] تھا
کرو گے یاد باتیں تو کہو گے — کہ کوئی رفتۂ بسیار گو[۴] تھا
جہاں پُر ہے فسانے سے ہمارے — دماغِ عشق ہم کو بھی کبھو تھا

۱؎ اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہم اپنی ہستی سے غافل رہے یہ غلطی تھی، ہم کو سمجھنا چاہیئے کہ ہماری ہستی کے پردے میں تو ہی جلوہ گر ہے ۱۲ ۲؎ تدھر پرانی زبان ہے اب جدھر فصیح ہے ۱۲

۳؎ رو تھا، یعنی منھ تھا، رخ تھا، اب اس طرح نہیں بولتے ۱۲ ۴؎ بسیار گو، بہت باتیں بنانے والا گو کا واو اردو میں مجہول فصیح ہے۔ پرانے شعرا باتباع فارسی واو معروف سے کہہ جاتے تھے اب اس کو عیب تنافر کہتے ہیں ۱۲

مگر[1] دیوانہ تھا گل بھی کسو کا — کہ پیراہن میں سو جاگہ رفو تھا

نہ دیکھا میرؔ آوارہ کو، لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

(۳)

نصیحت میرؔ نے مجکو یہی کی — کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

(۴)

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا — غنیمت ہے جہاں میں دم ہمارا
رکھے رہتے ہیں دل پر ہاتھ اے میرؔ — یہیں شاید کہ سب ہے غم ہمارا

(۵)

فلک نے پیس کر سرمہ بنایا — نظر میں اُس کی میں تو بھی نہ آیا
زمانے میں مرے شورِ جنوں نے — قیامت کا سا ہنگامہ اُٹھایا
قریبِ دیر خضر آیا تھا لیکن — ہمیں رستہ نہ کعبے کا بتایا
حقِ صحبت نہ طیروں[2] کو رہا یاد — کوئی دو پھول اسیروں تک نہ لایا

(۶)

موئے ہم جس کی خاطر بے وفا تھا — نہ جانا اُن نے تو یوں بھی کہ کیا تھا

---

[1] مگر بمعنی شاید۔ پھول کی پتیوں میں جو ریشے اور چھوٹی چھوٹی بندکیاں سی نظر آتی ہیں اُس کو رفو سے استعارہ کیا ہے۔ جاگہ جگہ کے بدلے میں کہا ہے جو پرانی زبان ہے ۱۲ [2] طیر، بمعنی پرند۔ جس کی عربی جمع طیور ہے۔ میرؔ نے بقاعدۂ اُردو اس کی جمع طیروں لکھی ہے جس کا استعمال ایسا فصیح نہیں بلکہ "طائروں میں" فصیح ہے ۱۲

معالج کی نہیں تقصیر ہرگز — مرض ہی عاشقی کا لا دوا تھا
نہ ملیو چاہنے والوں سے اپنے — نہ جانے تجھ سے یہ کن[1] نے کہا تھا
پریشاں کر گئی فریادِ بلبل — کسو سے دل ہمارا بھی لگا تھا
ملے برسوں، وہی بیگانگی تھی — ہمارے زعم[2] میں وہ آشنا تھا
نہ دیوانے تھے ہم سے قیس و فرہاد — ہمارا طورِ عشق اُن سے جدا تھا
صنم خانے سے اُٹھ کعبے گئے ہم — کوئی آخر ہمارا بھی خدا تھا

(۷)

سخن[3] مشتاق ہی عالم ہمارا — بہت عالم کرے گا غم ہمارا
پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے — رہے گا دیر تک ماتم ہمارا
نہیں ہی مرجع[4] آدم اگر خاک — کدھر جاتا ہی قدِ خم ہمارا

[1] کن نے۔ پُرانی بولی ہی۔ اب کس نے فصیح ہی ۱۲ [2] زعم۔ زے کے پیش اور زبر (فتحہ) دونوں طرح صحیح ہی مگر زیادہ پیش سے بولا جاتا ہی ۱۲ [3] سخن مشتاق، نظم کی وجہ سے اُلٹی ترکیب موزوں ہوئی ہی۔ دراصل مشتاقِ سخن ہی۔ فارسی میں جب مضاف آخر میں اور مضاف الیہ اول ہو جاتا ہی تو اضافت قائم نہیں رہتی۔ جیسے خانۂ نعمت" سے "نعمت خانہ" "خانۂ طعام" سے "طعام خانہ" وغیرہ۔ یہی ترکیب "سخن مشتاق" میں ہی۔ میر صاحب کے پانچویں اور چھٹے دیوان میں اس قافیہ اور ردیف میں دو غزلیں ہیں اور دونوں کے مطلعوں کا ایک ہی مصرع دونوں جگہ چھپا ہوا ہی (سخن مشتاق ہی عالم ہمارا) وہی یہاں نقل کر دیا گیا۔ ممکن ہی کہ چھاپے اور کاتب کی غلطی سے ایسا ہوا ہو یا دراصل میر صاحب نے دونوں غزلوں میں ایک ہی مصرع رہنے دیا ہو ۱۲ [4] مرجع۔ رجوع ہونے کی جگہ۔ جائے قرار۔ جائے پناہ ۱۲

زمین و آسماں زیر و زبر ہی   نہیں کم حشر سے اودھم ہمارا
کسو کے بال برہم دیکھتے میر
ہوا ہی کام[1] دل درہم ہمارا

پندرہواں وزن

بحرِ ہزج ۸ رکنی نمبر (۱): مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

(۱)

نہ وے زنجیر کے غل ہیں، نہ وے جرگے غزالوں کے   مرے دیوانہ پن ہی تک رہا معمور ویرانا
دھرا سر نزع میں زانو پہ رکھکر یوں لگا کہنے   کہ اے بیمار میرے تجھ پہ جلد آساں ہو مرجانا
نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی
گیا ہو[2] میر دیوانہ رہا سودا[3] سو مستانا

(۲)

تفحص[4] فائدہ، ناصح! تدارک[5] تجھ سے کیا ہوگا   وہی پاوے گا میرا درد دل جس کا لگا ہوگا
معیشت ہم فقیروں کی سی اخوانِ[6] زماں سے کر   کوئی گالی بھی دے تو کہہ، بھلا بھائی، بھلا ہوگا

---

۱ کام کے معنی مقصد و مدعا کے ہیں۔ نہ فعل (کار) کے۔ کار کے معنی ہیں کام اردو کا لفظ ہی ۱۲
۲ گیا ہو، یعنی ہو کر گیا ۱۲ ۳ سودا - مرزا رفیع سودا جو ان کے معاصر تھے ۱۲ ۴ تفحص، بروزن تکلف، بمعنی تلاش و جستجو ۱۲ ۵ تدارک، بمعنی علاج و تدبیر ۱۲ ۶ اخوان - جمع اخ کی بمعنی برادر بھائی - اخوان کا تلفظ پہلے الف کے زیر (کسرہ) سے صحیح ہے - زبر (فتحہ) سے غلط ہی ۱۲

قیامت کرکے اب تعبیر جس کو کرتی ہی خلقت ۔۔۔ وہ اُس کوچے میں اک آشوب سا شاید ہوا ہوگا

کہیں ہی میرؔ کو مارا گیا شب اُس کے کوچے میں

کہیں وحشت میں شاید بیٹھے بیٹھے اٹھ گیا ہوگا

(۳)

زمیں اک صفحۂ تصویرِ بے ہوشاں سے مانا ہی ۔۔۔ یہ مجلس جب سے ہی اچھا نہیں ہی رنگ صحبت کا

جہاں جلوے سے اُس محبوب کے یکسر لبالب ہی ۔۔۔ نظر پیدا کر اوّل پھر تماشا دیکھ قدرت کا

خرابی دل کی اس حد ہی کہ یہ سمجھا نہیں جاتا ۔۔۔ کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدّت کا

نگاہِ مست نے اُس کی لُٹائی خانقہ ساری ۔۔۔ پڑا ہی برہم اب تک کارخانہ زہد و طاعت کا

(۴)

عجب ہم بے بصیرت ہیں کہاں کھولا ہی بار اپنا ۔۔۔ یہاں سے لوگ سب رختِ سفر کرتے ہیں بار اپنا

نہ ہو یوں میکدہ مسجد سا، پر واں ہوش جاتے ہیں ۔۔۔ ہوا ہی دونوں جاگہ ایک دو باری گزار اپنا

سراپا آرزو ہم لوگ ہیں کاہے کو رندوں میں ۔۔۔ رہے ہیں اب تلک جیتے ویے دل مار مار اپنا

---

۱ قیامت کرکے، یعنی قیامت سمجھکر۔ قیامت کا نام رکھکر ۱۲ ۲ تعبیر کرنا۔ نسبت دینا۔ مطابقت کرنا ۱۲ ۳ خَلقت، خ کے زبر (فتحہ) سے بمعنی مخلوق۔ اور خ کے زیر (کسرہ) سے بمعنی پیدایش۔ فطرت۔ جِبِل ۱۲ ۴ آشوب۔ ہنگامہ۔ شور و غل ۱۲ ۵ شب۔ بغیر کو کے پرانی زبان ہی۔ اب اس طرح نہیں بولتے بلکہ شب کو کہتے ہیں ۱۲ ۶ مانا، بمعنی مثل و مانند ۱۲ ۷ لُٹانا۔ یہاں بے ہوش و بے خبر کرنے کے معنی ہیں ہی۔ نہ برباد اور بانٹ دینے کے معنی ہیں ۱۲ ۸ بے بصیرت، یعنی بے بصر۔ اندھے ۱۲ ۹ بار یعنی اسباب۔ سامان ۱۲ ۱۰ رخت کے معنی بھی اسباب کے ہیں ۱۲ ۱۱ بار۔ اس بار کے معنی لادنے کے ہیں یعنی کسی پر بوجھ لادنا ۱۲ ۱۲ باری۔ دفعہ۔ بار۔ اب باری فصیح نہیں ۱۲

(۵)

رہے بدحال صوفی حال کرتے[1] دیر مجلس میں ‫ مُغنّی[2] سے سُنا مصرع جو میرے شعرِ حالی[3] کا

نظر بھر دیکھتا کوئی تو تم آنکھیں چھپا لیتے ‫ سماں اب یاد ہوگا کیا تمھیں وہ خُردسالی کا

چمک یاقوت کی چلتی ہی اتنی دور کا ہے کو ‫ اچنبھا ہی نظر بازوں کو اُن ہونٹوں کی لالی کا

دماغ اپنا تو اپنی فکر ہی میں ہو چکا یکسر[4] ‫ خیال اب کس کو ہی اے ہم نشیں نازک خیالی کا

سولھواں وزن

بحرِ سریع، ۶ رکنی، نمبر (۱) : مفتعلن مفتعلن فاعلن یا فاعلات

(۱)

چوری میں دل کی وہ ہنر کر گیا ‫ دیکھتے ہی آنکھوں میں گھر کر گیا

دہر میں، میں خاک بسر ہی رہا ‫ عمر کو اس طور بسر کر گیا

کس کو مرے حال سے تھی آگہی ‫ نالۂ شب، سب کو خبر کر گیا

مجلسِ آفاق میں پروانہ ساں[5] ‫ میرؔ بھی شام اپنی سحر کر گیا

---

[1] حال کرنا، جھومنا۔ وجد میں آنا۔ صوفی مسلمانوں کا ایک مشہور فرقہ جو اللہ کے سوا ماسوا کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ جن کے سربرآوردہ بزرگوں میں شیخ عبدالقادر محی الدین جیلانیؒ جن کو بڑے پیر بھی کہتے ہیں اور خواجہ معین الدین چشتی اجمیری وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم گزرے ہیں ۱۲ [2] مُغنّی۔ گانے والا۔ قوّال ۱۲ [3] شعرِ حالی۔ یعنی حسبِ حال شعر ۱۲ [4] ہو چکا یکسر۔ یعنی بالکل مٹ چکا ۱۲ [5] ساں۔ حرفِ تمثیل بمعنی مثل، طرح۔ اب بغیر نون کے (سا) بولتے ہیں ۱۲

سترہواں وزن

بحرِ رمل، ۸ رکنی، نمبر (۳)   فَعِلاتُ فاعِلاتن فعلات فاعِلاتن

(۱)

یہ بھی طُرفہ[1] ماجرا ہی کہ اُسی کو چاہتا ہوں   مجھے چاہیے ہی جس سے بہت احتراز کرنا

اٹھارہواں وزن

بحرِ متقارب ۱۶، رکنی نمبر (۶)   فعولُ فعْلن فعولُ فعْلن فعول فعْلن فعولُ فعْلن

(۱)

بہار آئی چلو چمن میں ہوا کے اوپر بھی رنگ آیا   کہاں تلک گُل نہ ہووے غنچہ رہا مُندے منھ تو تنگ آیا
چھلے ہیں مونڈھے پھٹی ہی کہنی چسپے ہی چولی[2] پھنسے ہی ٹھہری   قیامت اُس کی ہی تنگ پوشی ہمارا جی تو بہ تنگ[3] آیا
وہی ہی رونا وہی ہی کُڑھنا وہی ہی شورش جوانی کی سی
بڑھاپا آیا ہی عشق ہی میں یہ پھیر ہم کو نہ ڈھنگ آیا

---

[1] طُرفہ، بمعنی عجیب، نئی بات ۱۲ [2] چسپے ہی چولی۔ چولی دامن کے اوپر کے حصے کو کہتے ہیں عورتوں کے محرم کو بھی چولی کہتے ہیں چَپنا غالباً چسپاں ہونے سے مراد ہی اب یہ لفظ نہیں بولا جاتا ۱۲ [3] بتنگ آنا۔ تنگ ہونا۔ دق ہونا ۱۲

انیسواں وزن

بحر متقارب ۸ رکنی نمبر (۱)   فعولن فعولن فعولن فعولن

(۱)

منھ اپنا کبھو وہ ادھر کر رہے گا — ہمیں عشق ہی تو اثر کر رہے گا
جو دلبر ہی ایسا تو دل جا چکا ہی — کسو روز آنکھوں میں گھر کر رہے گا
ہر اک کام موقوف ہی وقت ہی پر — دلِ خوں شدہ بھی جگر[1] کر رہے گا

(۲)

جو تو ہی صنم ہم سے بیزار ہوگا — تو جینا ہمیں اپنا دشوار ہوگا
غمِ ہجر رکھے گا بے تاب دل کو — ہمیں کڑھتے کڑھتے کچھ آزار ہوگا
جو افراطِ[2] الفت ہی ایسا تو عاشق — کوئی دن میں برسوں کا بیمار ہوگا
اُچٹتی ملاقات کب تک رہے گی — کبھی تو تہِ دل[3] سے بھی یار ہوگا
تجھے دیکھ کر لگ گیا دل، نہ جانا — کہ اس سنگ دل[4] سے ہمیں پیار[5] ہوگا
یہی ہوگا کیا ہوگا میری[6] نہ ہوں گے
جو تو ہوگا بے یار و غم خوار ہوگا

---

[1] جگر کرنا۔ ہمت کرنا۔ کام کر جانا ۱۲ [2] افراط۔ بمعنی زیادتی۔ یہ لفظ مونث ہی۔ ممکن ہی میر نے بھی مونث ہی کہا ہو اور کاتب وغیرہ کے سہو سے "ایسا افراط" لکھ گیا ہو ۱۲ [3] تہِ دل سے یعنی سچے دل سے، خلوص کے ساتھ ۱۲ [4] و [5] یہ مصرع بطور انکار استفہامی کہا گیا ہی۔ مطلب یہ کہ تجھے دیکھکر دل تو لگا بیٹھے مگر یہ نہ سمجھے کہ ایسے سنگ دل سے ہمارا نباہ نہ ہوگا۔ یا وہ ہم کو پیار نہ کر سکے گا یہاں پیار، اخلاص و ربط کے مفہوم میں ہی ۱۲ [6] میری۔ صحیح میرہی ہی۔ یہ انداز گویائی اُس وقت کے لئے جائز تھا۔ اب بغیر اظہار ہ نہیں بولتے ۱۲

حالاتِ غالبؔ

ولادت ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء   وفات ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء

ولادت و خاندان

اسد اللہ خاں نام عرف میرزا نوشہ۔ اسد اور غالبؔ تخلّص نجم الدولہ، دبیر الملک نظام جنگ، خطابات جو ابوظفر بہادر شاہ بادشاہ دہلی۔ کے دربار سے ملے۔ باپ کا نام عبد اللہ بیگ خاں، عرف میرزا دولھا۔ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ ہجری میں بمقام اکبر آباد (آگرہ) پیدا ہوئے، مرزا کے خاندان کا حال جیسا کہ اُنھوں نے اپنی تحریروں میں جا بجا ظاہر کیا ہے یہ ہے کہ ان کے آبا و اجداد قوم کے ترک تھے، جن کا سلسلۂ نسب تور ابنِ فریدوں بادشاہ ایران تک پہنچتا ہے۔ مرزا کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان آئے اور اُمراے عہد کی وساطت و سفارش سے سلطنت کی حیثیت کے موافق ایک اچھے منصب کو حاصل کیا۔ مرزا کے والد، اول لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے دربار سے متوسل رہے، پھر چند روز بعد حیدر آباد دکن پہنچے اور سرکار آصفی میں کئی برس تک فوجی عہدہ دار رہے۔ پھر آگرے چلے آئے۔ اس کے بعد مہاراجہ الور کے دربار میں اُمیدوار تھے کہ اسی زمانے میں ریاست الور کی ایک خانہ جنگی کے سلسلے میں وہ مخالف کی روک تھام کے لئے بھیجے گئے کہ اسی جھگڑے میں اُن کے گولی لگی اور وہیں اُن کا انتقال ہو گیا۔ انھیں مختلف توسّل و تعلق کی بنیاد پر مرزا کے خاندان کی پرورش وغیرہ کے لئے کچھ جاگیر اور پنشن مقرر تھی

جس کے متعلق سرکار انگریزی کے عہد میں اکثر جھگڑے اور رکاوٹیں رہیں بالآخر سات سو روپے سالانہ مرزا غالب کو ۱۸۵۷ء تک ملتے رہے، غدر ۱۸۵۷ء کے بعد دو تین سال تک یہ پنشن بند رہی اور جب مرزا کی ہر طرح سے بریت ہو گئی تو وہ پنشن آخر عمر تک جاری رہی۔

تعلیم مرزا غالب کے بچپن ہی میں اُن کے والد کا انتقال ہو گیا اور وہ سنِ شعور تک آگرے ہی میں رہے۔ اگرچہ سات برس کی عمر سے وہ دہلی آنے جانے لگے تھے لیکن شادی کے بعد تک اُن کی مستقل سکونت آگرے ہی میں رہی، اور وہیں تعلیم پاتے رہے، اور اُس زمانے کے مروّجہ نصاب کے مطابق عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھ کر بخصوصیت فارسی میں تکمیل کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں ایرانیوں کی طرح قابلیت حاصل کی۔

شادی مرزا کے چچا (نصر اللہ خاں) کا رشتہ نواب فخر الدولہ (خاندان لہارو) کے خاندان میں ہو چکا تھا، اس لئے اُن کے خاندان سے ایک طرح کا تعلق پیدا ہو گیا تھا، اسی نسبت سے مرزا غالب کی شادی نواب فخر الدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کے ہاں قرار پائی اور تیرہ برس کی عمر میں ۷۔ رجب ۱۲۲۵ھ ہجری کو اُن کا عقد ہو گیا۔ اس تقریب سے اُن کی آمد و رفت دہلی میں زیادہ ہو گئی اور آخر کار یہیں سکونت اختیار کر لی اور اخیر عمر تک دلّی ہی میں رہے۔

مسکن دلّی میں اُن کے قیام کا زمانہ قریب پچاس برس کے معلوم ہوتا ہے۔ اس تمام مدت میں اُنھوں نے غالباً یہاں کوئی مکان اپنے لئے نہیں خریدا ہمیشہ کرائے کے مکانوں میں رہا کئے یا ایک مدت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرائے کے رہے تھے، جب ایک مکان سے جی اُکتا یا، اُسے چھوڑ کر

دوسرا مکان لے لیا، مگر قاسم جان کی گلی، یا حبش خاں کے پھاٹک، یا اُس کے قرب وجوار کے سوا کسی اور محلے میں جا کر نہیں رہے۔ سب سے آخیر مکان جس میں اُن کا انتقال ہوا، حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوان خانے سے متصل مسجد کے عقب میں تھا جس کی نسبت وہ کہتے ہیں: ؎

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے　　یہ بندہ کمینہ ہمسایہ خدا ہے

استعدادِ علمی اور مطالعۂ کتب

ذہن رسا اور طبع سلیم کے ساتھ ایرانیوں کی تعلیم اور اہل کمال کی صحبتوں نے اُن کی واقفیت کو حدِ کمال تک پہنچا دیا تھا، اور اپنے حافظہ و یادداشت میں اتنی قوت پیدا کر لی تھی کہ جو باتیں اور نکتے زمانۂ تعلیم اور صحبت اہل کمال میں نقش خاطر ہو گئے تھے اُن میں کمی نہیں ہونے پاتی تھی، جس طرح اُنھوں نے تمام عمر رہنے کے لئے مکان نہیں خریدا، اسی طرح مطالعے کے لئے بھی باوجودے کہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گزری، کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی، الّا ماشاء اللہ۔ ایک شخص کا یہی پیشہ تھا کہ کتاب فروشوں کی دکانوں سے لوگوں کو کرائے کی کتابیں لا کر دیا کرتا تھا، مرزا صاحب بھی ہمیشہ اُسی سے کرائے پر کتابیں منگواتے تھے اور مطالعے کے بعد واپس کر دیتے تھے۔

شاعری جس کا ملکہ (مہارت) اُن کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا اُس سے قطع نظر کر کے فارسی زبان اور فارسی الفاظ و محاورات کی تحقیق اور اہل ایران کے انداز و ترکیبِ بیان پر مرزا کو اس قدر عبور تھا کہ خود اہل ایران میں، چیدہ اور خاص آدمیوں کو، ایران کے مستند شعرا کی زبان پر اس قدر عبور رہو گا۔

موت اور مرض الموت

مرنے سے چند روز پہلے بے ہوشی طاری ہوگئی تھی پہر پہر[2] دو دو پہر[2] کے بعد چند منٹ کے لئے افاقہ ہو جاتا تھا پھر بے ہوش ہو جاتے تھے۔ اور اکثر یہ شعر ورد زبان رہتا تھا ؎

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

آخر ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ ہجری کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرہویں کو تہتّر[۷۳] برس اور چار[۴] مہینے کی عمر میں دنیا سے رحلت کی، اور درگاہ حضرت شاہ نظام الدین اولیا میں اپنے خسر کے پایئنِ مزار دفن کئے گئے۔ "آہ غالب بمرد" اُن کے انتقال کی تاریخ ہے، جس میں بقول مولانا حالی دس بارہ[۱۲] آدمیوں کو توارد ہوا۔

کلام کی تنقید

مرزا غالب نے اپنے منتخب کلام (گل رعنا) پر جو دیباچہ فارسی میں لکھا ہے، اُس میں لکھتے ہیں کہ "میں نے اوّل اُردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا"۔ مگر جس انداز میں وہ آغاز ہوا اس کا اندازہ اس حکایت سے بخوبی ہوتا ہے جو مرزا کی زبانی مولانا حالی نے سنی تھی، یعنی میر تقی میر نے جو مرزا کے ہم وطن تھے اُن کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اُس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکنے لگے گا"۔ مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر اپنے ایرانی اُستاد ملا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب، فارسیت کا رنگ ابتدا ہی سے مرزا کی بول چال اور اُن کی قوّتِ متخیلہ پر چڑھ گیا تھا۔ مرزا نے لڑکپن میں مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی کا کلام زیادہ دیکھا تھا، چناں چہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی اُسی روش پر مرزا غالب نے اُردو میں

چلنا اختیار کیا تھا جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں : ؎

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے

مرزا غالبؔ کے حق میں جو پیشین گوئی میر تقی میرؔ نے کی تھی وہ دونوں طرح ان کے حق میں پوری ہوئی یعنی مرزا اوّل اوّل ایسے رستے پر پڑ لئے تھے کہ اگر اُن کی طبیعت کی راستی، اور سلامتِ ذہن، اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک اور نکتہ چیں ہم عصروں کے اعتراضات اور طعن وتشنیع سدّ راہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزلِ مقصود سے بہت دُور جا پڑتے۔ چوں کہ مرزا کی طبیعت فطرۃً نہایت سلیم واقع ہوئی تھی اس لیے نکتہ چینوں کے اعتراضوں سے اُن کو بہت بڑا سبق حاصل ہوا اور آہستہ آہستہ اُن کی طبیعت راہ پر آتی گئی۔ اس کے سوا مولوی فضلِ حق خیر آبادی سے مرزا کی راہ و رسم بہت بڑھ گئی اور مرزا اُن کو اپنا خالص ومخلص دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے تو اُنھوں نے اس قسم کے اشعار پر بہت روک ٹوک کرنی شروع کی یہاں تک کہ اُنھیں کی تحریک سے مرزا نے اپنے اُردو کلام میں سے جو اُس وقت موجود تھا دو تہائی کے قریب نکال ڈالا اور اُس کے بعد اُس روش پر چلنا چھوڑ دیا۔ مرزا نے جو روش ابتداءً ریختے (اُردو) میں اختیار کی تھی وہ کسی طرح مقبولِ خاطر و عام پسند نہیں ہو سکتی تھی، شعر کی بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی ہے کہ اِدھر قائل کے منہ سے نکلا اور اُدھر سننے والے کے دل میں اتر گیا مرزا کے ابتدائی کلام میں یہ بات بالکل نہ تھی، جیسے خیالات اجنبی تھے ویسی ہی زبان غیر مانوس تھی، مگر چوں کہ مرزا معمولی انداز سے جو عام شعرا میں رائج تھے، بچتے تھے اس لئے وہ بہ نسبت اس کے کہ شعر عام فہم ہو جائے اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرزِ خیال اور طرزِ بیان میں جدّت اور نرالا پن پایا جائے۔ مرزا ایک مدت کے بعد

اپنی غلط روش سے خبردار ہوئے اور استقامت طبع اور سلامتی ذہن نے اُن کو راہ راست پر ڈالے بغیر نہ چھوڑا۔ یہ امر جتا دینا ضروری ہے کہ مرزا نے ریختہ گوئی (اُردو شاعری) کو اپنا فن قرار نہیں دیا تھا بلکہ محض تفریح طبع کے طور پر کبھی اپنے دل کی اُپج سے، کبھی دوستوں کی فرمائش سے، اور کبھی بادشاہ یا ولی عہد کے حکم کی تعمیل کے لئے ایک آدھ غزل لکھ لیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اُن کے اُردو دیوان میں غزل کے سوا کوئی صنف کافی مقدار میں نہیں پائی جاتی۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ شاعر اور اُس کے کلام کے رتبے کا اندازہ اُس کے کلام کی کمی اور زیادتی سے نہیں ہوتا بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اُس کے منتخب اور پسندیدہ اشعار کس درجے کے ہیں

خصوصیاتِ کلام

مرزا غالب کے کلام میں علاوہ جدّتِ مضامین اور بلندیٔ خیالات کے چار خصوصیتیں قابل لحاظ ہیں۔

(۱) عام اور ذلیل و پامال تشبیہوں کو جہاں تک ہو سکتا ہے استعمال نہیں کرتے۔

(۲) مرزا نے استعارہ و کنایہ اور تمثیل کو جو اُس زمانے کے لٹریچر کی جان اور شاعری کا ایمان ہے۔ ریختے میں بھی نسبتاً اپنے فارسی کلام کے کم استعمال نہیں کیا۔

(۳) تمام کلام، کیا ریختہ، کیا فارسی، کیا نظم، کیا نثر سب میں باوجود سنجیدگی اور متانت کے اُن کی شوخی و ظرافت نمایاں ہے مرزا سے پہلے ریختہ گو شعرا میں دو شخص شوخی و ظرافت میں بہت مشہور گزرے ہیں، ایک سودا دوسرے انشا مگر دونوں کی تمام شوخی و خوش طبعی، ہجو گوئی یا فحش و تمسخر میں صرف ہوئی۔ بخلاف مرزا غالب کے کہ انھوں نے ہجو، فحش اور ہزل سے کبھی

زبانِ قلم کو آلودہ نہیں کیا،

(۴) چوتھی خصوصیت مرزا کی طرزِ ادا میں ایک خاص چیز ہی جو دوسروں کے ہاں اس قدر نمایاں نہیں یعنی اُن کے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلودار واقع ہوتا ہی کہ بظاہر اُس کے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد اُس میں ایک دوسرے لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں مثلاً :-

کیوں کر اُس بت سے رکھوں جان عزیز　　کیا نہیں ہی مجھے ایمان عزیز

اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اُس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لے گا۔ اس لئے اُس سے جان کو عزیز نہیں رکھتا۔ مگر دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اُس بت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہی (کیوں کہ اُس کی محبت عین ایمان ہی) پھر اُس سے جان کس طرح عزیز رکھی جاسکتی ہی۔

ان چار خصوصیتوں میں ابتدائی تین خصوصیتوں سے عموماً تمام اہلِ ذوق متفق ہیں البتہ چوتھی خصوصیت میں صرف اتنی گنجائشِ گفتگو ہی کہ مرزا غالب کا یہی پہلودار انداز بعض بعض مقامات پر ایسا پیچیدہ اور جادۂ اعتدال سے ہٹا ہوا نظر آتا ہی کہ اُس کو اُردو کی شاہراہ بناتے ہوئے ذرا تامّل ہوتا ہی۔

انتخاب غزلیات

غالبؔ

بحر خفیف ۶، رکنی نمبر (۱)　　فاعلاتن مفاعلن فعلن

(۱)

درد منت کشِ دوا نہ ہوا　　میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو　　اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں　　تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب　　گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی　　آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ[۱] نمرود کی خدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

---

[۱] اس شعر میں پہلے خدائی اور بندگی کے معنی ذہن نشین کرنے چاہئیں، یہ دونوں لفظ ذومعنین ہیں ایک خدائی کے معنی خدا ہونا۔ دوسری خدائی کے معنی مخلوق۔ اسی طرح بندگی کے ایک معنی عبادت، دوسرے عبدیت۔ نمرود جس نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا بہرحال مخلوق میں شامل تھا، اُس کے دعوائے خدائی نے اُسے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا اور بندہ ہونے کی حالت میں اُس نے خدا بننے کا دعویٰ کیا اور تباہ ہوا، اس مثال کے بعد مرزا غالب کہتے ہیں کہ کیا میری بندگی نمرود کی خدائی تھی کہ اُس سے نقصان کے سوا کچھ فائدہ نہ ہوا۔ یہاں بندگی کے معنی عبدیت ہیں نہ عبادت ۱۲

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
[۱] زخم گر دب گیا لہو نہ تھما — کام گر رُک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دل ستانی[۲] ہے — لے کے دل دلستاں[۳] روانہ ہوا
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

(۲)

بحرِ رمل۔ مسدس رکنی نمبر(۵) فاعلاتن فِعلاتن فعلن یا فعِلات یا فِعلن یا فِعلات

[۴] پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل جگر تشنۂ فریاد آیا
[۵] دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

---

[۱] اس شعر میں بھی دب جانا اور رُک جانا ہم معنی ہے۔ اور روا کے معنی جاری رہنے کے ہیں جیسے کارروائی اور حاجت روا میں۔ مطلب یہ ہے کہ جب کوئی کام رُک جاتا ہے تو پھر وہ جاری نہیں رہتا مگر میں ایسا بدنصیب ہوں کہ میرا زخم دب گیا یعنی رُک گیا پھر بھی اُس کا لہو جاری رہا ۱۲ [۲] دل ستانی بمعنی معشوقی دل لینا ۱۲ [۳] دل ستاں، دل لینے والا۔ معشوق ۱۲ [۴] اس شعر میں دوسرے مصرع کا مطلب پہلے سمجھنا چاہیئے یعنی میرے دل و جگر میں فریاد کی تشنگی پیدا ہوئی۔ یہاں آیا فارسی محاورے کا ترجمہ ہے اردو میں اس کی جگہ ہوا کہیں گے یعنی جب دل و جگر تشنۂ (خواہش مند) فریاد ہوئے تو مجھے اپنا دیدۂ تر یاد آیا کہ اُس کے رونے سے کچھ نہ کچھ تشنگی کم ہو گی ۱۲ [۵] دوست کے رخصت ہوتے وقت جو اضطراب یا دردناک کیفیت پیدا ہوئی تھی اُس کو قیامت سے تعبیر کیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اُس حالت سے ابھی تسکین نہیں ہوئی تھی کہ پھر وہی وقتِ سفر یاد آ گیا اور اضطراب بڑھنے لگا ۱۲

سادگی ہائے تمنا یعنی[1] | پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل[2] | نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی[3] | کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی | گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں[4] | دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال | دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

لے عاشق اپنی تمنا کی سادگی اور سادہ لوحی کا اظہار کرتا ہے کہ اُس معشوق کی نیرنگ سازی کے فریب میں آنے کے لئے پھر آمادہ ہیں جس نے بار ہا اُن کو ناکام رکھا اور دھوکا دیا ۱۲ ۲ یہ مصرع بالکل فارسی کے انداز اور ترکیب سے کہا ہے۔ عذرِ واماندگی کے بعد ذرا وقفہ کرکے آگے پڑھا جائے اور بیاں سے "قبول کر" محذوف مانا جائے تو مطلب پورا ہوگا اس طرح کہ اے حسرتِ دل میرے عاجز رہنے اور واماندگی کا عذر قبول کر ایک نالہ کرتا تھا کہ مجھے اپنا جگر یاد آگیا۔ یعنی نالہ کروں گا تو جگر شق ہو جائے گا۔ دوسرے مصرع میں نالہ کرتا تھا کے بعد کاف بیانیہ محذوف مانا جائے گا ۱۲ ۳ زندگی بسر ہونے کے لئے کسی پر عاشق ہونا ہی ضروری نہیں اس کلیئے کو پیش نظر رکھ کر اس شعر کا مطلب سمجھا جائے مدعا یہ ہے کہ اگر تیری راہ گزر میں نہ جاتے تو بھی بہر حال زندگی گزر جاتی وہاں جاکر ہزاروں قسم کی مصیبتوں تکلیفوں اور آزاروں میں مبتلا ہو گئے اس سے تو بہتر تھا کہ وہاں نہ جاتے اور زندگی گزار دیتے۔ لفظ "رہگزر" کو مرزا غالب نے مذکر لکھا ہے مگر اب مونث بولتے ہیں ۱۲ ۴ نالہ و فریاد اور ان کی تاثیر وغیرہ کا تعلق جگر و دل سے ہے اس بنا پر کہا گیا ہے کہ جگر جو مدت ہوئی خون ہوکر بہ گیا اب اُس کی یاد آتی ہے اور اس لئے یاد آتی ہے کہ دل میں نالہ و فریاد کی جرأت نہیں اور اس سے میں تنگ آگیا ہوں ۱۲

کوئی ویرانی سی ویرانی ہی ۔ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا[1]

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ[2]
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

بحر رمل، ۸ رکنی نمبر (۱) فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن یا فعلات یا فعلن یا فعلات

(۳)

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا ۔ آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر[3] بھی تھا
تم سے بے جا ہی مجھے اپنی تباہی کا گلہ ۔ اس میں کچھ شائبہ[4] خوبیٔ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہی تو پتا بتلا دوں ۔ کبھی فتراک[5] میں تیرے کوئی نخچیر[6] بھی تھا
قید[7] میں ہی ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد ۔ ہاں کچھ اک رنج گراں باریٔ زنجیر بھی تھا

---

[1] اس شعر کے بھی دو معنی ہیں اول یہ کہ جنگل کی ویرانی کو دیکھکر گھر یاد آتا ہی اور جی چاہتا ہی کہ گھر کو واپس ہو جائیں۔ دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ پہلا مصرع بطور انکار استفہامی کہا گیا ہی یعنی جنگل کی ویرانی بھی کوئی ویرانی ہی (یعنی کچھ نہیں) اس ویرانی کو دیکھکر اپنا گھر یاد آتا ہی کہ وہاں کی ویرانی اس سے بڑھی ہوئی ہی ۱۲ [2] دیوانہ و مجنوں کو دیکھکر لڑکے اکثر اینٹ پتھر مارا کرتے ہیں اسی بات کی طرف اشارہ کرکے کہا گیا ہی کہ ہم نے لڑکپن میں مجنوں پر پتھر اٹھایا ہی تھا کہ انجام بینی سے اپنا سر یاد آگیا یعنی ہم بھی عاشق مزاج ہیں کہیں ہمارا بھی یہی حال نہ ہو۔ مرزا غالب کا نام اسد اللہ تھا اور نام کی رعایت سے ابتداءً مرزا صاحب نے اپنا تخلص اسدؔ رکھا تھا۔ جو غزلیں اس تخلص کے ساتھ ہیں وہ غالبؔ ہونے سے پہلے کی کہی ہوئی ہیں ۱۲ [3] عناں گیر عناں یعنی لگام۔ یہاں عناں گیر سے مراد ہی روکنے والا ۱۲ [4] شائبہ یعنی شرکت، شمول ۱۲ [5] فتراک یعنی شکار بند ۱۲ [6] نخچیر۔ شکار صید ۱۲ [7] یعنی تیرا وحشی تیری زلف کی یاد کو جس میں پہلے قید رہ چکا ہی بھولا نہیں ہی البتہ اک گرانباری (وزنی، بوجھل) زنجیر کا اور بھی رنج تھا مگر زیادہ نہیں کچھ یوں ہی سا تھا ۱۲

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اُس کو کہوں اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

دیکھ کر[۱] غیر کو ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا وے طالبِ تاثیر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں، رکھیئے نہ فرہاد کو نام
ہمیں آشفتہ سروں[۲] میں وہ جواں میر[۳] بھی تھا

ہم تھے[۴] مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

بحر رمل ۶ رکنی نمبر (۴) فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلات

(۴)

جور[۵] سے باز آئیں پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجکو مُنھ دکھلائیں کیا

---

۱ یعنی غیر کو دیکھکر میرا دل کیوں نہ ٹھنڈا ہو کہ میں نے اُس کو روتے دیکھا اور ساتھ ہی وہ اپنی دعا کے اثر کا طالب بھی تھا یہ دیکھکر میں خوش ہوا کہ اُس کی آہ و فغاں بھی بے اثر ہی ۱۲ ۲ آشفتہ سر پریشان حال، عاشق ۱۲ ۳ جواں میر بمعنی جواں مرگ ۱۲ ۴ یعنی مرنے کے لئے تیار و آمادہ تھے اور وہ پاس نہ آسکتا تھا تو کیا اس کے ترکش (تیر رکھنے کا آلہ) میں کوئی تیر بھی نہ تھا جس کو دُور سے پھینک کر ہمیں نشانہ بنا لیتا ۱۲ ۵ جور سے باز آکر یہ کہنا کہ "ہم تجکو کیا مُنھ دکھلائیں" بجائے خود ایک ظلم ہی کیوں کہ عاشق کو معشوق کا نہ ملنا ایسا ستم ہی جس کے سامنے ہر ستم ہلکا ہی۔ اس بنا پر کہا گیا ہی کہ اگرچہ وہ ظلم سے باز آئیں مگر پھر بھی باز نہیں آسکتے ۱۲

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ[۱] ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

موجِ غم سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

[۲] پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی تبلاؤ کہ ہم تبلائیں کیا

---

[۱] لاگ بمعنی دشمنی اور لگاؤ، محبت۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کو ہمارے ساتھ نہ دشمنی ہے نہ دوستی اگر دشمنی بھی ہوتی تو اس لئے کہ اُس میں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے ہم اُس کو دوستی سمجھتے لیکن جب نہ دوستی ہو اور نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھایا جائے۔ لاگ اور لگاؤ ایسے دو لفظ یکجا کیے ہیں جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو دوچند کر دیا ہے ۱۲

[۲] اس مقطع کے متعلق راقم حروف کے ایک بزرگ نے جو مطلب بیان کیا تھا وہ خود مرزا غالب سے سنا ہوا تھا۔ بطور یادگار یہاں لکھا جاتا ہے۔ مرزا کے کسی دوست نے اپنی آمد کی اطلاع دی اور لکھا کہ جناب میرے لئے کسی قسم کا تکلف نہ فرمایا جائے اور اس بات کو باصرار بار بار لکھا، یہاں تک کہ اُن کی آمد کا زمانہ آگیا تو مرزا نے اپنے مکان کا تمام سامان فرش و فروش اُٹھوا دیا اور اُن کے آتے وقت ننگ دھڑنگ لنگوٹا باندھکر اور بھبھوت مل کر ڈیوڑھی میں بیٹھ گئے۔ وہ نو وارد دوست جنھوں نے اب تک مرزا صاحب کو نہیں دیکھا تھا جب ڈیوڑھی میں پہنچے تو ان کو کوئی بیراگی، فقیر سمجھکر انھیں سے مرزا صاحب کا پتا پوچھا اس کے جواب میں مرزا نے یہ مقطع پڑھا۔ اس لطیفے سے شعر کا مطلب بخوبی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ اصل مدعا پوچھنے والے کی ناواقفیت یا تجاہل عارفانہ کا اظہار کرنا ہے اور خود اپنے بتانے میں تامّل کا پہلو نظر آتا ہے ۱۲

بحر رمل، ۸ رکنی نمبر (۱) فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلات

(۵)

دوست[۱] غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خانہ زادِ[۲] زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا رہیں دلّی میں پر کھائیں گے کیا

---

۱ احباب واقربا میری غمخواری کیا کر سکتے ہیں؟ مانا کہ ناخن تراش کر زخم پر مرہم لگا دیا ہے اور اپنی تدبیر پر مطمئن ہو گئے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ جب تک زخم بھرے گا میرے ناخن بھی بڑھ جائیں گے اور میں پھر اُس زخم کو نوچ ڈالوں گا اور اس طرح اُن کی ساری کوشش رائگاں جائے گی ۱۲ ۲ مطلب یہ ہے کہ ہم زلف کے (جو زنجیر سے زیادہ ہے) غلام خانہ زاد ہیں تو زنجیر سے کیا بھاگیں اور قید گرفتاری سے کیا گھبرائیں گے کیوں کہ وفا کے پابند ہیں جو قید سے بھی زیادہ ہے۔ یعنی ناصح ہم کو زنجیر اور قید سے کیا ڈراتا ہے ہم کو ان سے زیادہ سخت چیزوں سے سابقہ پڑ چکا ہے اور ہم اُس کے عادی ہو رہے ہیں ۱۲

ہیں ۱۲

(۶)

بحر مضارع ۸، رکنی نمبر (۱) مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاعلن یا فاع لات

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر — جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن — جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں — لیوے[۱] نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم — سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اُس بتِ کافر کا پوجنا — چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر[۲] کہے بغیر

مقصد[۳] ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہرچند[۴] ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا[۵] ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

---

۱ لیوے پرانی زبان ہے اب اس کی جگہ صرف "لے" یا "لیتا ہے" بولتے ہیں ۱۲ ۲ لفظ کافر فارسی میں بفتحِ فا بھی مستعمل ہے اسی بنا پر ساغر کا ہم قافیہ کہا گیا ہے۔ ورنہ صحیح فے کے زیر (کسرہ) سے ہے ۱۲ ۳ شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ مدعائے خاص غمزہ و ناز کا ذکر ہے مگر بغیر اندازِ شاعرانہ بیان میں کوئی لطف نہیں آتا اس لئے استعارہ و تشبیہ کے سوا چارہ نہیں ہے۔ دشنہ بمعنی خنجر ۱۲ ۴ یہ شعر بھی پہلے شعر کی طرح استعارہ و مجاز کے اندازِ بیان کو ظاہر کرتا ہے یعنی گفتگو خواہ مشاہدۂ حق (معرفتِ حق) ہی کے متعلق کیوں نہ ہو مگر وہاں بھی وہی طرز پسندیدہ ہے جو شاعرانہ رنگ میں ہو ۱۲ ۵ یہ شعر مرزا غالب کے حسبِ حال ہے کہ وہ آخر عمر میں بہرے ہو گئے تھے ۱۲

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض — ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

(۷)

بحر ہزج [۱] ۸- رکنی نمبر (۳) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن یا فعولان

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا — ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا [۲] کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے — کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم [۳] تھے مرے گھر کے — پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد [۵] کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیّر [۴] سے لڑائی — بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری نہ بہر حال یہ مدّت خوش و ناخوش — کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب — قسمت میں ہے مرنے کی تمنّا کوئی دن اور

[۱] یہ غزل مرزا غالب نے اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کی جواں مرگی کے نوحے میں لکھی ہے ۱۲ [۲] ناصیہ فرسا۔ یعنی جبیں سائی۔ سر رگڑنا۔ ناصیہ عربی میں پیشانی کو کہتے ہیں ۱۲ [۳] ماہِ شبِ چار دہم چودھویں رات کا چاند۔ بدرِ کامل ۱۲ [۴] نیّر۔ نواب ضیاء الدین خاں رئیس لوہارو کا تخلص تھا۔ رخشاں بھی انھیں کا تخلص تھا اور وہ مرزا غالب کے عزیز ترین شاگرد تھے ۱۲

[۵] داد و ستد۔ یعنی لین دین ۱۲

(۸)

بحر رمل ۸ - رکنی نمبر ۲۰ فاعلاتن فِعلاتن فِعلاتن فعِلن یا فعِلات یا فعْلن یا فعْلات

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک[1] کون جیتا ہی تری زلف کے سر ہونے تک
دام ہر موج میں ہی حلقۂ صد کام نہنگ[2] دیکھیں کیا گزرے ہی قطرے پہ گُہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب[3] دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن[4] خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
پرتوِ خور سے ہی شبنم کو فنا کی تعلیم[5] میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

[1] سر ہونا - ایک محاورہ ہی جس کا مفہوم انکشاف حال کے لئے کوشش وسعی کرنا ہی مطلب یہ ہی کہ آہ کو ایک عمر چاہیئے کہ اثر پیدا کرے اور جب تک آہ میں اثر پیدا ہوگا اور تیری زلف ہمارے حالِ پریشان سے خبردار ہوگی ہم اُس وقت تک کب زندہ رہ سکتے ہیں ۱۲ [2] نہنگ - ناکے کو فارسی میں کہتے ہیں - دام یعنی جال جس کو موج سے مشابہت دی گئی ہی - کام بمعنی جبڑا - تالو - منھ - جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہی وہ صرف اس قدر ہی کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہی ۱۲ [3] اس شعر کا مطلب یہ ہی کہ عاشقی کے معاملات میں صبر کرنے کی ضرورت ہی اور تمنّا جلد باز ہی تو مجھے اس کش مکش اور متضاد حالت سے یہ فکر ہوگئی ہی کہ جب تک جگر کا خون ہو اور قصّہ اختتام کو پہنچے اُس وقت تک میں اپنے دل کا کیا حال کروں اور کیوں کر ضبط کروں - جگر کے خون ہونے کا مطلب ہی کہ جب جگر خون ہو جائے گا اُس وقت آہ میں اثر آئے گا - اس غزل کی ردیف بعض نسخوں میں ہوتے تک (تے کے ساتھ) بھی دیکھی گئی ہی - دونوں طرح صحیح ہی ۱۲ [5] یعنی جس طرح آفتاب کے پرتو (شعاع - گرمی) سے شبنم بھاپ بن کر اُڑ جاتی ہی میں بھی اسی طرح ایک نظرِ عنایت میں فنا ہو جاؤں گا مطلب یہ ہی کہ میری ہستی شبنم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور شبنم مجھے فنا کی تعلیم دیتی ہی ۱۲

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل[1] گرمئ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(۹)

بحر خفیف ۶ - رکنی نمبر (۱) فاعلاتن مفاعلن فعلن

وہ فراق اور وہ وصال کہاں[2] وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے اب وہ رعنائیِ[3] خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ[4] عشق واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

---

[1] اس شعر میں ناپائداری حیات کی طرف اشارہ ہے یعنی فرصت (قیام) ہستی ایسی ہے جیسے کہ آگ کی چنگاری یا شمع کا شرارہ نکلتے ہی آناً فاناً چمک کر مٹ جاتا ہے اسی طرح ہماری ہستی مٹ جائے گی ۱۲

[2] غزل کے اشعار عموماً بلحاظ مضمون جدا جدا کہے جاتے ہیں یعنی ہر شعر ایک مستقل مضمون رکھتا ہے لیکن کبھی کبھی قطعہ بند غزل بھی کہی جاتی ہے چنانچہ مرزا غالبؔ کی بعض غزلیں مسلسل ایک ہی مضمون میں ہیں انھیں میں یہ غزل بھی ہے جس میں گزشتہ زمانے کی باتوں کو یاد کیا گیا ہے ۱۲ [3] رعنائی بمعنی آراستگی رنگینی ۱۲ [4] قمار خانہ - جوا کھیلنے کی جگہ - چوں کہ عشق و محبت میں دل کی بازی لگتی ہے اس مناسبت سے قمار خانہ کہا گیا ہے ۱۲

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہو گئے قُوا[1] غالب
وہ عناصر[2] میں اعتدال[3] کہاں

(۱۰)

بحر مُجتث ۸ - رکنی نمبر(۱) مفاعلن فِعِلاتن مفاعِلن فِعِلن یا فعلان یا فعْلن یا فعلان

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں
مگر[4] غبار ہوئے[5] پر ہوا اُڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں[6] بال و پر میں خاک نہیں
یہ کس بہشت[7] شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گُل رہ گزر میں خاک نہیں
بھلا اُسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا[8]
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں
خیالِ[9] جلوۂ گل سے خراب ہیں مے کش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

---

[1] قُوا یا قُویٰ دونوں املا صحیح ہیں۔ قوّت کی جمع۔ حواس اور مختلف قوّتیں جن کا تعلق دل و دماغ سے ہوتا ہے ۱۲ [2] عناصر۔ صاد مکسور ہے۔ جمع عُنصُر بمعنی اصل و بنیاد، جس سے مزاج اور طبیعت انسانی کی تخلیق ہوتی ہے یعنی مٹّی، ہَوا، پانی اور آگ ۱۲ [3] اِعتدال یکسانیت، برابری، معتدل حالت ۱۲ [4] مگر۔ بمعنی شاید ۱۲ [5] ہوئے پر۔ اب نہیں بولتے۔ ہو جانے یا ہونے پر بولیں گے ۱۲ [6] تواں بضمِ اوّل بمعنی طاقت تے کے زبر (فتحہ) سے غلط ہے ۱۲ [7] بہِشت۔ بکسرِ اول و دوم بمعنی باغ۔ بہشت شمائل استعارہ ہے حسین اور گُل رو سے ۱۲ [8] یعنی اگر اُس کو مجھ پر رحم نہیں آتا تو میں ہی اپنے حال پر رحم کروں اور نالہ و فریاد سے باز آؤں۔ کیوں کہ وہ بالکل بے اثر ہیں اور ایسے بے نتیجہ کام سے کیا فائدہ ۱۲ [9] اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ شراب خانے میں در و دیوار کے سوا کچھ موجود نہیں اب مے کش جو مست ہو رہے ہیں وہ صرف جلوۂ گل کے خیال سے مست ہو رہے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ زندگی کو پُر لطف بنانے والی خیالی محبت کی مستی ہے ورنہ اس ناپائدار عالم میں کیا رکھا ہے ۱۲

ہوا[۱] ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ — سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ — کھُلا کہ فائدہ عرضِ[۲] ہنر میں خاک نہیں

(۱۱)

بحر رمل ۸ رکنی نمبر (۲) فاعلاتن فعِلاتن فعِلاتن فعلن یا فعلاتُ یا فِعلن یا فعِلات

کی وفا[۳] ہم سے تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں — ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے — کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو — جو مے و نغمہ کو اندوہ[۴] رُبا کہتے ہیں

---

۱ یعنی عشق وہ بلائے روزگار ہے کہ جس گھر میں قدم رکھتا ہے اُس کو برباد و غارت کر دیتا ہے میں عشق کی غارت گری سے شرمندہ ہوں کہ میرے گھر میں حسرتِ تعمیر کے سوا خاک بھی نہیں ہے۔ اس شعر میں لفظ خاک مناسبت تعمیر کی وجہ سے خاص لطف رکھتا ہے ۱۲ ۲ عرضِ ہنر سے اظہارِ کمال مراد ہے ۱۲ ۳ یعنی معشوق نے جو ہم سے وفاداری کی ہے تو رقیب اُس کو جفا کہتے ہیں۔ یہ تو قدیم سے دستور چلا آتا ہے کہ اچھوں کو حاسد اور دشمن بُرا کہا کرتے ہیں حال آں کہ وہ بُرا نہیں ۱۲ ۴ اندوہ رُبا۔ یعنی غم مٹانے والا۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جو نغمہ و شراب کو غم غلط کرنے والے سامان میں شمار کرتے ہیں وہ پُرانے زمانے کے بھولے بھالے لوگ ہیں۔ مے و نغمہ اندوہ رُبا نہیں ہے بلکہ اندوہ افزا (غم بڑھانے والا) ہے اس لئے کہ جب کوئی سامانِ نشاط آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو یادِ یار تازہ ہو جاتی ہے اور بجائے غم غلط ہونے کے اور زیادہ ہو جاتا ہے ۱۲

[1] دل میں آ جائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

[2] ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

[3] پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

[4] اک شرر دل میں ہے اُس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

[1] یعنی جب مجھے غش سے افاقہ ہوتا ہے تو معشوق کا خیال دل میں آجاتا ہے اور یہی نالۂ رسا کا اثر ہے۔ معلوم نہیں اور کون سے نالے کو رسا کہا جا سکتا ہے اس سے زیادہ نالے کی رسائی اور کیا ہوگی کہ خیال معشوق ہوش آتے ہی دل میں موجود ہو جاتا ہے ۱۲ [2] پَرے۔ اُس طرف۔ مسجود۔ خدا۔ ادراک۔ عقل و فہم۔ مدعا یہ ہے کہ اہلِ نظر کے لئے قبلہ صرف قبلہ نما کی حیثیت رکھتا ہے جس سے اصل مسجود (خدا) کا پتا ملتا ہے ۱۲ [3] مہر گیا ایک بوٹی ہے اُس کی جڑ انسان کی شکل کی ہوتی ہے۔ مشہور ہے کہ جو آدمی اپنے پاس اُس جڑ کو رکھتا ہے اُس پر لوگ مہربان ہو جاتے ہیں اس بنا پر غالب کہتے ہیں کہ تجکو ہمارے زخمی پاؤں پر جس میں کانٹے چُبھے ہیں جب سے رحم آیا ہے تو راہ کے کانٹوں کو ہم کانٹا نہیں کہتے بلکہ مہر گیا کہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے تجکو ہم پر رحم آیا ۱۲ [4] شرر سے مراد روح حیوانی ہے جس کا وجود دورانِ خون اور اُس کی حرارت کی بدولت قائم ہے۔ ایسے شرر سے گھبرانے کی کیا ضرورت ہے بلکہ گھبرانے کی جگہ ہم تو اپنی سانس کے ذریعے سے (جس کو ہوا سے تعبیر کیا ہے) اور بھڑکاتے رہتے ہیں تاکہ زندگی حرارت غریزی کی وجہ سے قائم رہے اسی بنا پر ہوا کہکر آگ کی طلب مقصود اصلی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ہوا ہی سے آگ مشتعل ہوتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ وہ شرر شرر نہیں بلکہ در اصل ہوا ہے جس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ۱۲

دیکھئے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ[1]	اُس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں
وحشت و شیفتہ[2] اب مرثیہ کہویں[3] شاید	مرگیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

(۱۲)

بحر مجتث ۸ رکنی نمبر (۱) مفاعلن فِعِلاتن مفاعلن فِعِلن یا فِعلان یا فَعلن یا فَعلان

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں	کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے	کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو	یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہرِ[1] طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں	ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

[1] نخوت - بمعنی غرور - نامِ خدا - کلمۂ تعریف بمعنی ماشاء اللہ، سبحان اللہ - مدعا یہ ہے کہ ہم اُس مغرور کی ہر بات پر واہ وا - سبحان اللہ کہتے ہیں - دیکھئے اس عمل یا خوشامد کے بعد اُس شوخ کا غرور کس حد تک پہنچتا ہے ۱۲ [2] شیفتہ سے مراد نواب مصطفٰے خاں شیفتہ رئیس جہاں گیر آباد ہیں - اور وحشت سے غلام علی خاں یہ دونوں مرزا غالب کے خاص الخاص دوستوں میں معرّف تھے، کہویں پرانی زبان ہے، اب کہیں فصیح اور مروّج زبان ہے ۱۲ [3] جواہر - جمع جوہر - طرف بسکون رائے مہملہ بمعنی گوشہ - مفہوم یہ ہے کہ ہم اُن جواہرات کو کیا دیکھیں جو تیری ٹوپی کے گوشے میں ٹکے ہوئے ہیں ہم تو لعل و گہر کے نصیبے کی بلندی کو دیکھتے ہیں کہ ان سنگریزوں اور پانی کے قطروں (موتی) کو یہ مرتبہ اور اوج حاصل ہوگیا ہے ۱۲

(۱۳)

بحر رمل ۸۔ رکنی نمبر (۱) فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلات

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاقِ نسیاں[1] ہو گئیں
تھیں بنات النعش[2] گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں
قید میں یعقوب[3] نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

۱؎ طاقِ نسیاں سے مراد بھول جانا ہے چوں کہ اکثر چیزیں طاق پر رکھ کر ذہن سے اتر جاتی ہیں۔ اس بنا پر اُس طاق کو طاقِ نسیاں کہتے ہیں ۱۲ ۲؎ آسماں پر شمالی جانب سات ستارے ہیں جن میں سے چار ستارے جنازے (کھٹولے) کی شکل میں نظر آتے ہیں اور تین جنازہ اٹھانے والوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں کو بنات النعش کہتے ہیں۔ بنات جمع بنت بمعنی دختر۔ نعش۔ جسم۔ لاش ۱۲ ۳؎ یعقوبؑ کی آنکھوں کو روزنِ دیوار سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح روزنِ زنداں ہر وقت کھلا رہتا ہے اسی طرح یعقوبؑ کی آنکھیں رات دن یوسفؑ کی طرف نگراں رہتی تھیں۔ روزن کی تشبیہ میں ایک خوبی یہ اور ہے کہ حضرت یعقوب کی آنکھیں انتظار کرتے کرتے بے نور ہو گئی تھیں اور نابینائی کی وجہ سے کسی وقت بند نہ ہوتی تھیں۔ یہی صورت روزن کی ہوتی ہے کہ وہ کھلا ہوتا ہے مگر بے نور ۱۲

سب رقیبوں[1] سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے / ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

جوئے[2] خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق / میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام / قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں / تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

ہیں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں[3] کھل گیا / بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

وہ نگاہیں[4] کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار / جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

[1] دنیا بھر کے عاشقوں کا قاعدہ ہے کہ اپنے رقیبوں سے ناخوش ہوا کرتے ہیں لیکن مصر کی عورتوں سے زلیخا خوش ہے کہ یہ عورتیں یوسفؑ پر عاشق ہوگئیں یہ اشارہ وتلمیح ہے اس روایت کی طرف کہ جب زلیخا کا حضرت یوسفؑ سے عشق ظاہر ہوگیا تو زنانِ مصر زلیخا کو ایک غلام پر عاشق ہونے کا طعنہ دینے لگیں۔ زلیخا نے ان عورتوں کے ہاتھ میں ایک ایک لیموں اور ایک ایک چھری دے دی اور کہا کہ تم جب یوسفؑ کو دیکھنا تو چھریوں سے لیموں تراش لینا جب حضرت یوسفؑ سامنے بلائے گئے تو ان عورتوں نے لیموں تراشنے کے بدلے اپنی اپنی انگلیاں کاٹ لیں زلیخا یہ دیکھکر خوش ہوئیں کہ اب تو یہ نہ کہیں گی کہ ایک زرخرید غلام پر عاشق ہوئی ۱۲ [2] جوئے خوں، یعنی خون کی ندی۔ مدعا یہ ہے کہ شب فراق کی شام کو جو خون آنکھوں سے بہہ رہا ہے اسے بہنے دو۔ میں ان کو روشن شمعیں سمجھوں گا جس سے شب فراق کا اندھیرا کم ہو جائے گا خون اور آگ کی سرخی شمع اور خون میں وجہ تشبیہ ہے ۱۲ [3] دبستاں یعنی مکتب، ادبستان کا مخفف ۱۲ [4] شعرا نگاہ کو تیر، تلوار سے تشبیہ دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ نگاہ بہت دور تک پہنچتی ہے، مرزا کہتے ہیں وہ نگاہیں جو میری کم نصیبی سے مژگاں بن گئی ہیں وہ اتنی دراز کس طرح ہوگئیں کہ دل کے پار ہوئی جاتی ہیں ۱۲

بسکہ روکا[۱] میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے — میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں
واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب — یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں
جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا — سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں
ہم موحّد[۲] ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

(۱۴۱)

بحر رجز ۸ - رکنی نمبر(۳) مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن یا مفاعلان

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں — روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں — بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اُٹھائے کیوں

[۱] یعنی بار بار میری آہوں نے زور کیا اور اُبھرنا چاہا، لیکن میں نے اُبھرنے نہ دیا اور ضبط سے کام لیا، اسی وجہ سے میری آہیں میرے سینے میں ایسی چپک کر رہ گئی ہیں جیسے بخیہ کے ڈورے اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک نئی تشبیہ اور نیا مضمون ہے ۱۲ [۲] موحّد۔ توحید پرست۔ تمام ملتوں اور مذہبوں کو من جملہ دیگر رسوم کے قرار دیا ہے جن کا ترک کرنا اور مٹانا موحد کا اصل مذہب ہے نتیجہ یہ نکلا کہ یہی ملتیں اور رسمیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزائے ایماں بن جاتی ہیں ۱۲

جب[1] وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منھ چھپائے کیوں

دشنۂ[2] غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ[3] حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسن[4] اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عزّ و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں[5] وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

[1] یعنی جب وہ جمال جس سے دل روشن ہو اور دوپہر کے سورج کی طرح اس کے دیکھنے سے نگاہ قاصر ہو تو پردے میں پوشیدہ کیوں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ پردے میں نہاں نہیں ہے بلکہ آشکار ہے مگر اس پر بھی کوئی اس کو دیکھ نہیں سکتا ۱۲ [2] تیرے غمزے اور ناز کے تیر و خنجر جاں ستاں اور بے پناہ ہیں، تیرے سامنے ہرگز کسی کو آنا نہ چاہیئے اگرچہ وہ تیرا عکس ہی کیوں نہ ہو ممکن ہے کہ وہ بھی زخم کھا جائے۔ اس بیان میں نکتہ یہ ہے کہ تیرا عشق ایسی شی نہیں ہے کہ جو آدمی ہی تک محدود ہو بلکہ ہر چیز خواہ وہ مادی ہو یا نہ ہو سب پر اثر کر سکتا ہے ۱۲ [3] حیات اور غم در اصل جدا جدا نہیں بلکہ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے جب تک آدمی کی حیات ہے غم بھی موجود ہے اور جب یہ نہ ہوگی غم بھی نہ ہوگا۔ قید اور بند میں صنعتِ تقابل ہے ۱۲ [4] اول تو حسن جس میں قدرتی دل کشی موجود ہے پھر یہ حسنِ ظن کہ حسن کی دل فریبی یقینی ہے جو دیکھے گا وہ عاشق ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ اس اعتماد و یقین کی وجہ سے دشمن کی شرم رہ گئی اور وہ آزمایا نہ گیا ۱۲ [5] عموماً نصیحت کرنے والے عاشق کو سمجھاتے ہیں کہ تمہارا معشوق بے وفا دشمنِ دین ہے اسے چھوڑ دو، اس کے جواب میں مرزا کہتے ہیں کہ ہاں نہ وہ خدا پرست ہے نہ باوفا ہے تو جس کو دین و دل عزیز ہو وہ وہاں نہ جائے ۱۲

(۱۵)

بحر رمل ۸۔ رکنی نمبر(۱) فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلات

قطعہ

[۱] رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیئے — کوئی ہم سایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو بیمار دار [۲] — اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(۱۶)

بحر مضارع ۸۔ رکنی نمبر(۲) مفعولُ فاع لات مفاعیلُ فاع لن یا فاع لات

[۳] مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے — بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر — آخر ستم کی کچھ تو مکافات [۴] چاہیئے

---

[۱] یہ تینوں شعر قطعہ بند ہیں معنی ظاہر ہیں اور بآسانی سمجھے جا سکتے ہیں ۱۲ [۲] بیمار دار۔ بمعنی تیمار دار مریض کی دیکھ بھال اور خدمت کرنے والا ۱۲ [۳] شعرا آنکھ کو میخانہ اور ابرو کو محراب مسجد سے تشبیہ دیتے ہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے قبلۂ حاجات (یہ اشارہ واعظ یا شیخ یا زاہد کی طرف ہے) مسجد کے برابر میخانہ ضرور بنانا چاہیئے جس طرح بھوں کے پاس آنکھ قدرت نے بنا دی ہے۔ بھوں اگرچہ صحیح اور داخلِ روزمرّہ ہے مگر اپنے تلفّظ کے بھونڈے پن سے اس جگہ فصیح نہیں ۱۲

[۴] مُکافات، میم مضموم ہے۔ بمعنی سزا ۱۲

سیکھے ہیں[1] مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ[2] بےخودی مجھے دن رات چاہیئے

ہے[3] رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

سر[4] پائے خم پہ چاہیئے ہنگامِ بےخودی ق
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے

یعنی[5] بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیئے

دے[6] داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیئے

نشو[7] و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے

(۱۷)

بحر رمل ۳ رکنی نمبر (۵) فاعلاتن فِعلاتن فِعلن یا فِعلات یا فَعلن یا فَعلات

عشق مجکو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

---

[1] سیکھے ہیں - اب نہیں بولتے پرانی زبان ہے - ہم نے سیکھی ہے فصیح ہے ۱۲ [2] اک گونہ - یعنی ذرا سی برائے نام ۱۲ [3] یعنی باغ میں طرح طرح کے پھول ہوتے ہیں ہر ایک کی بو جدا اور رنگ علاحدہ ہوتا ہے مگر بہار کا ثبوت ہر ایک سے ملتا ہے بہار سب میں پوشیدہ ہے ۱۲ [4و5] اس قطعے میں عارفانہ مستی کے مسلک کے آداب اور طریقے بتائے ہیں یعنی بحالتِ بیخودی خم (بڑا مٹکا شراب کا) پر سر رکھنا چاہیئے اور قبلہ رو ہو کر مناجات کرنا چاہیئے اور حسب حیثیتِ صفات اصل ذات کی معرفت حاصل کرنا چاہیئے ۱۲
[6] تلافیِ مافات، گزری ہوئی باتوں کا بدلہ ۱۲ [7] اصل - یعنی بنیاد - جڑ - فروع فرع کی جمع - یعنی شاخیں - نشو و نما سے مراد ہے پھیلاؤ - پیداوار - مدعا یہ ہے کہ خاموشی اصل اور جڑ ہے اور نطق اس کی فرع لہذا خاموشی بے معنی نہیں ہے بلکہ ہر بات اسی سے پیدا ہوتی ہے ۱۲

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی — اے[۱] وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن[۲] تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی[۳] ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر[۴] ہر چند کہ ہے برق خرام — دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ نا انصاف — آہ و فریاد کی رخصت[۵] ہی سہی

---

۱ اے یہاں حرف ندا نہیں ہے بلکہ اکثر حسن کلام کے لئے زائد بولا جاتا ہے ۱۲ ۲ اس شعر میں ایک طنز کا پہلو نکلتا ہے جو از راہ بے تکلفی کہا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ ہم کچھ اپنے دشمن تو ہیں نہیں کہ ایسی صورت میں کہ تجکو غیر سے محبت ہے ہم بھی تیری محبت کا دم بھر کر اپنے دشمن بن جائیں۔ ایک شارح اس کے معنی یہ لکھتے ہیں کہ "غیر کو تم سے محبت ہے تو سہی، ہم بھی جانتے ہیں، مگر ہم بھی تو دشمن نہیں ہیں، ہم بھی تو اپنے ہی ہیں، ہم کو بھی تجھ سے محبت ہے پھر ہم کو اُس کے (غیر) مقابلے میں ذلیل کیوں سمجھا جاتا ہے"۔ مگر ان آخری معنوں میں 'اپنے' کا جوڑ ٹھیک نہیں بیٹھتا ۱۲ ۳ یعنی انسان جو کچھ واقفیت اور غرض رکھے وہ اپنی ہی ذات سے رکھے اگر اپنی ہستی سے آگاہ ہو گیا۔ کیا کہنا اُس نے اللہ کو پہچان لیا اور اگر یہ نہ ہو سکے تو غافل بنا رہے۔ دوسری فکروں میں پڑنا اپنے آپ کو برباد کرنا ہے۔ نہایت عارفانہ شعر ہے ۱۲ ۴ عمر اپنی روانی میں برقی رفتار رکھتی ہے پھر بھی اتنی فرصت مل جانی ممکن ہے کہ دل کو خون کر لیا جائے۔ دل کو خون کرنا استعارہ ہے عشق و محبت سے ۱۲ ۵ رخصت بمعنی اجازت ۱۲

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے | بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ | گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

(۱۸)

بحر رمل ۶ - رُکنی نمبر (۲) فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلات

کوئی دن گر زندگانی اور ہی[۱] | اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہی
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں | سوزِ غم ہائے نہانی اور ہی
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں | پر کچھ اب کے سرگرانی[۲] اور ہی
دے کے خط مُنھ دیکھتا ہی نامہ بر | کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہی
قاطعِ اعمار[۳] ہیں اکثر نجوم | وہ بلائے آسمانی اور ہی

[۱] یعنی اگر ہماری حیات کچھ باقی ہی تو ہم نے بھی اپنے دل میں کچھ اور ٹھان رکھی ہی۔ دوسرے مصرع سے بہت سے معانی نکلتے ہیں اور یہ کمال فصاحت ہی اور اسی کو الکنایۃ ابلغ من الصراحۃ کہتے ہیں یعنی بعض اشارے اور کنائے صراحت اور تشریح سے زیادہ پُر لطف اور بلیغ ہوتے ہیں۔ ہر آدمی اپنی مصیبتوں اور حالتوں کو دیکھکر اور یاد کر کے آیندہ کے لئے کوئی نہ کوئی ارادہ کر سکتا ہی اور اس موقع پر یہی کہے گا کہ خیر اب اگر زندگی باقی ہی تو ہم نے بھی فلاں ارادہ کر لیا ہی ۱۲ [۲] سرگرانی بمعنی خفگی۔ رنجیدگی ۱۲ [۳] قاطعِ اعمار عمروں کو قطع کرنے والا۔ مدعا یہ ہی کہ اکثر ستاروں کے اثر سے عمریں گھٹ جاتی ہیں مگر وہ بلائے آسمانی (معشوق) اپنے اثر میں سب سے بڑھا ہوا ہی ۱۲

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

(۱۹)

بحر خفیف ۶۔ رُکنی نمبر (۱) فاعلاتن مفاعِلن فعلن یا فعلان یا فعِلن یا فعِلان

کوئی اُمّید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت[ا] کا ایک دن معیّن ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں — میری آواز گر نہیں آتی
داغِ[۲] دل گر نظر نہیں آتا — بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ا موت تو اس لئے نہیں آتی کہ اس کا ایک وقت معیّن و مقرر ہے کہ اس سے پہلے آ ہی نہیں سکتی مگر نیند کو کیا ہو گیا ہے وہ رات بھر کیوں نہیں آتی یا یہ کہ موت اپنے وقت پر آ کر رہے گی آخر نیند اُس کی فکر میں کیوں اُڑ گئی ہے اور آتی نہیں ہے ۱۲ ۲ اگر تجھے میرا داغِ دل دکھائی نہیں دیتا تو داغ کی بو بھی نہیں آتی۔ یعنی اگر میری محبت سے انکار ہے تو کیا میرے انداز مجنونانہ سے بھی نہیں پہچان سکتا ۱۲

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی[1]　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس منھ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

(۲۰)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　آخر اس درد[2] کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق[3] اور وہ بیزار　　یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منھ میں زبان رکھتا ہوں　　کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن[4] نہیں کوئی موجود (ق)　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں　　غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے　　نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

---

[1] مرتے ہیں، یعنی موت کے بہت آرزومند ہیں۔ موت آتی ہے یعنی موت کا آنا لازمی اور ضروری ہے۔ رات دن سیکڑوں آدمیوں کا مرنا دیکھتے اور سنتے رہتے ہیں مگر ہم کو موت نہیں آتی ہم نہیں مرتے ۱۲ [2] اس درد۔ سے مراد دردِ عشق ہے اور دردِ عشق لا علاج مرض ہے ۱۲
[3] مشہور ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے مگر یہاں عجیب حالت ہے کہ ہم اس کے آرزومند و مشتاق اور وہ ہم سے ناراض و بے زار ہے ۱۲ [4] تجھ بن۔ تیرے سوا۔ اب یہ لفظ متروک ہے
یہ چار شعروں کا قطعہ ہے جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جب یہ مسلّم ہے کہ تیرے یعنی خدا کے سوا کوئی شئے موجود نہیں ہے تو دنیا کے تمام مناظر اور ہنگامے جن میں پری چہرہ (حسین) اور ان کے غمزہ و عشوہ (معشوقانہ ناز ادا) اور بل کھائی ہوئی زلفِ عنبریں اور سرمہ بھری ہوئی آنکھ وغیرہ وغیرہ شامل ہیں کہاں سے آگئیں ۱۲

سبزہ وگل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمّید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

(۲۱)

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے[۱] — سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز — پھر وہی پردۂ عماری[۲] ہے
چشم، دلّالِ[۳] جنسِ رسوائی — دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی[۴] — وہی صد گونہ اشک باری ہے
دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر — محشرستانِ بے قراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے — روزِ بازارِ جاں سپاری[۵] ہے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے

---

۱ یہ پوری غزل قطعہ بند ہے اور عشق و حسن کے مختلف اثرات وجذبات اور کوائف و مناظر شاعرانہ انداز میں دکھائے ہیں ۱۲ ۲ عماری- محمل- ہودج ۱۲ ۳ دلّال- خریدار و بیچنے والے میں سودا کرانے والا ۱۲ ۴ وہی سیکڑوں رنگ اور انداز سے نالہ کشی اور اشک باری کرنا ۱۲ ۵ جان دینا یا جان سونپنا ۱۲

پھر کھلا ہی درِ عدالتِ ناز — گرم بازارِ فوجداری ہی
ہو رہا ہی جہان میں اندھیر — زلف کی پھر سرشتہ[ا] داری ہی
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال — ایک فریاد و آہ و زاری ہی
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب — اشک باری کا حکم جاری ہی
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا — آج پھر اُس کی روبکاری[۲] ہی

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہی جس کی پردہ داری ہی

(۲۲)

پھر[۳] اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی[۴]
کہ زمیں ہو گئی ہی سر تا سر — روکشِ[۵] سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے — چشمِ نرگس کو دی ہی بینائی

---

[۱] سرشتہ داری - سردفتری - میر منشی، اہلکاری ۱۲ [۲] روبکاری یعنی پیشی ۱۲
[۳] یہ غزل بھی مسلسل ہی اور ابو ظفر بادشاہ دہلی کے غسل صحت کی مبارکباد میں کہی گئی ہی ۱۲ [۴] عالم آرائی دنیا کی آراستگی ۱۲ [۵] روکش یعنی مدِ مقابل ۱۲

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی[1]

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہِ دیں دار نے شفا پائی

(۲۳)

بحر ہزج ۸ ۔ رکنی نمبر (۳) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن یا فعولان

[2] بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ[3] سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ[4] مسیحا مرے آگے

[5] جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

[6] ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

۱؎ یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے اس باد پیمائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دیئے ہیں۔ باد پیمائی فضول کام کو کہتے ہیں۔ لہٰذا ایک معنی تو یہ ہوئے کہ فصلِ بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اس میں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے اور جب کہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض باد پیمائی یعنی فضول کام ہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ جس طرح بادہ پیمائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں، اسی طرح باد پیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لئے جائیں تو اس صورت میں یہ مطلب ہو گا کہ آج کل ہوا کھانے میں شراب پینے کا مزا ہے ۱۲

۲؎ اس غزل کے مضامین بھی مسلسل ہیں۔ بازیچۂ اطفال بچوں کے کھیل کی جگہ ۱۲ ۳؎ اورنگ یعنی تخت ۱۲ ۴؎ اعجاز۔ معجزہ ۱۲ ۵؎ یعنی عالم صرف برائے نام ہے حقیقت کچھ نہیں ۱۲ ۶؎ یعنی میں دیوانگی کے عالم میں اتنی خاک اڑاتا ہوں کہ اس کے سامنے صحرا گرد ہے اور اس قدر روتا ہوں کہ دریا میرے سامنے پیشانی گھستا ہے یعنی عاجزی کرتا ہے ۱۲

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے[1] — تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں — بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما[2] مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار — رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا[3] مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا — کیونکر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے[4]

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر — کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا[5] مرے آگے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام[6] — مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے[7] — آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہے موج زن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو[8] — آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

[1] پیچھے۔ یعنی فراق ۱۲ [2] سیما۔ یعنی پیشانی۔ آئینہ سیما۔ حسین۔ خوبصورت ۱۲ [3] صہبا۔ شراب ۱۲

[4] یعنی اگر کوئی شخص معشوق کا نام میرے سامنے لیتا ہے تو میں بوجہ رشک کے بے لطف ہو جاتا ہوں لوگ اس کو نفرت پہ محمول کرتے ہیں، اس سے بہتر ہے میں رشک کرنا چھوڑ دوں، کیونکہ یہ تو کسی سے نہیں کہہ سکتا کہ اُس کا نام میرے آگے نہ لو ۱۲ [5] کلیسا، گرجا ۱۲ [6] یعنی ہوں تو میں عاشق مگر معشوق فریب عاشق ہوں، ساری دنیا کے معشوق میرے فریب میں آجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ لیلیٰ میرے سامنے مجنوں کو بُرا کہتی ہے ۱۲ [7] یعنی سب عاشق وصل میں خوش ہوتے ہیں مگر شادی مرگ نہیں ہو جاتی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شبِ فراق جو میں نے مرنے کی تمنا اور آرزو کی تھی وہ وصل میں میرے سامنے آئی ۱۲ [8] یعنی یہ جو ایک اشک خونی کا دریا میری آنکھوں سے بہہ رہا ہے کاش ایسا ہو کہ اسی مصیبت پر خاتمہ ہو جائے۔ مگر نہیں دیکھیے ابھی کیا کیا اور مصیبتیں میرے آگے آتی ہیں ۱۲

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہی　　رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہی میرا
غالب کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے

(۲۴)

بحر خفیف ۶ رُکنی نمبر (۱) فاعلاتن مفاعلن فعلن یا فعلاتن یا فعلن یا فعِلان

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی　　میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی　　ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال، جیسے کڑی کمان کا تیر　　دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہی　　وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

لہ یعنی اگرچہ اب ہاتھ حرکت نہیں کرتا اور جام اُٹھا کر منھ سے لگانے کی طاقت باقی نہیں رہی ہی۔ لیکن ابھی آنکھوں میں جان باقی ہی، شیشہ و ساغر کو ابھی میرے سامنے سے نہ اُٹھاؤ۔ میں دیکھ ہی کر مست ہو رہا ہوں ۱۲ لہ اس شعر میں "اچھا" اُردو کا خاص روزمرّہ ہی جس کا مفہوم "خیر کیا مضائقہ ہی" "سمجھوں گا" "دیکھوں گا" سے حاصل ہوتا ہی۔ یعنی غالب جو میرا ہم پیشہ و ہم مشرب ہم راز ہی۔ اس کو بُرا کہتے ہو اور پھر میرے آگے! اچھا دیکھا جائے گا ۱۲ سہ ابنِ مریم۔ حضرت عیسیٰؑ ۱۲ کہ شرع و آئین۔ قانون شریعت ۱۲
ھ کڑی کماں کا تیر بہت دُور جاتا ہی۔ اس کو چال سے تشبیہ دی ہی ۱۲

بک رہا ہوں جنون میں کیا کیا کچھ ۱ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سنو گر بُرا کہے کوئی نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے ۲ اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گِلا کرے کوئی

(۲۵)

بحر ہزج مثمن (۱) مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے ۳ جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

۱ یہ شعر اخلاق کا سبق دیتا ہے ۱۲ ۲ اس شعر میں خضر و سکندر کے مشہور قصے کی طرف اشارہ ہے حضرت خضر سکندر کو چشمۂ آب حیوان پر لے گئے تھے وہاں سکندر نے یہ دیکھ کر کہ چشمے کے گرد بہت سے آدمی زندہ تو ہیں مگر چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے سے معذور مضغۂ گوشت کی طرح زمین پر پڑے ہیں آب حیات نہ پیا، اسی قصے کی بنا پر کہا گیا ہے کہ خضر نے سکندر کی کیا مدد کی باوجود رہنمائی کے سکندر آب حیات سے محروم رہا ۱۲ ۳ یعنی اس خیال سے کہ تمام عمر اس پر ظلم کئے ہیں، اب تھوڑی سی نیکی کرنے سے اس کی کیا تلافی ہو سکے گی اس لئے نیکی نہیں کرتا اور شرما جاتا ہے ۱۲

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے | کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے
وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی | عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
اُدھر وہ بدگمانی ہے اِدھر یہ ناتوانی ہے | نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے | کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
تکلف[1] برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن | وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
ہوئے ہیں پانوں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی | نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت[2] ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

(۲۶)

بحرِ مضارع ۸ - رکنی نمبر (۲) مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاعلن یا فاع لات

[3]
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے | جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

---

[1] جلوہ نمائی یعنی نظارگی کی حالت میں یہ مانا کہ کوئی تکلف نہ رہے گا۔ مگر یہ غضب ہیں کس طرح گوارا کر سکوں کہ اُس کا نظارہ کیا جائے اور یہ رشک کی انتہائی صورت ہے کہ خود دیکھنا بھی پسند نہیں ۱۲ [2] وہ کافر (معشوق) جسے میں خدا کو بھی نہیں سونپتا اس کے متعلق یہ دیکھنا قیامت سے کم نہیں کہ وہ غیر کا ہم سفر ہو۔ اس شعر میں ہووے پُرانی زبان ہے اور ساری غزل میں آجائے ہے شرما جائے ہے وغیرہ سب پُرانے روزمرہ کے مطابق ہیں۔ اب شرماتا ہے۔ آجاتا ہے وغیرہ بولتے ہیں ۱۲

[3] یہ غزل بھی باعتبار مضامین مسلسل ہے۔ قدح یعنی جام جس کو چراغ سے مشابہ کیا ہے یعنی ایک ایک جام ایک ایک چراغ کا کام دے ۱۲

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو ۱ — عرصہ ہوا ہی دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہی دم ۲ — برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہی نفس ۳ — مدت ہوئی ہی سیرِ چراغاں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہی عشق ۴ — سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل ۵ — سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب ۶ — نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہی ۷ — پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہی خریدار کی طلب ۸ — عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

---

۱ یعنی پھر بیٹھا ہوا اپنے کلیجے کے ٹکڑے چن رہا ہوں کہ پھر دعوتِ مژگاں کا سامان کیا جائے مدعا گریہ و زاری سے ہی ۱۲ ۲ پھر ضبطِ جنوں سے دم گھٹنے لگا ہی اس وضعِ احتیاط کو ترک کر کے گریباں پھاڑتا ہوں ۱۲ ۳ پھر جی چاہتا ہی کہ پہلے کی طرح ایسے نالے کروں جن سے شرر برسنے لگیں، کیوں کہ مدت سے چراغاں کا تماشا نہیں دیکھا ہی ۱۲ ۴ پھر شورشِ عشق کی بدولت زخمِ دل پر نمک چھڑکنے کا سامان کر رہا ہوں ۱۲ ۵ پھر میں نے خامۂ مژگاں کو خونِ دل میں اس غرض سے ڈبویا ہی کہ صفحۂ دامن پر گل کاریاں کروں، یعنی خون کے آنسو روؤں ۱۲ ۶ پھر دل و دیدہ آپس میں رقیب بن گئے ہیں، دل نے خیالِ یار کی خیالی تصویر کھینچی ہی اور آنکھ نے نظارۂ روئے نگار کی حسرت ظاہر کی ہی ۱۲ ۷ پھر دل نے کوچۂ ملامت کے طواف کرنے کی خواہش ظاہر کی ہی اور غرور و خودداری کے بت خانے کو توڑ ڈالا ہی ۱۲ ۸ پھر شوقِ دل کسی خریدار معشوق کو ڈھونڈھ رہا ہی اور اس نے یعنی شوقِ دل نے متاعِ عقل و دل و جاں کی دکان لگائی ہی، مطلب یہ ہی کہ پھر کوئی معشوق خریدار بن کر ہم سے عقل و دل جان کا سودا کر لے ۱۲

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال[١] — صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا[٢] — جاں نذرِ دل فریبیٔ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس[٣] — زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو[٤] — سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ[٥] — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں — سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ[٦] طوفاں کیے ہوئے

---

١ پھر خیال حسینوں کی طرف سیکڑوں باغوں کا ساماں فراہم کیے ہوئے دوڑنے لگا ہے ١٢

٢ پھر میں یار کا خط کھولنا چاہتا ہوں، اس نے جو لفافے پر میرا پتا اور نام لکھا ہے وہ ایسا دل فریب ہے کہ اس کو جان نذر کرنی چاہتا ہوں ١٢ ٣ پھر مجھے ہوس ہے کہ کوئی معشوق سیاہ زلفیں چہرے پر بکھیرے ہوئے کوٹھے پر سے مجھے جھانک رہا ہو ١٢ ٤ مجھکو آرزو ہے کہ پھر کوئی میرے مقابلے میں مژگاں کی چھری کو سرمے سے تیز کیے ہوئے آجائے ١٢ ٥ پھر ایک نوبہارِ ناز (نوجوان) کو نظر تاک رہی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ چہرے کو فروغِ مے سے باغ کا ہم سر بناکر سامنے آجائے ١٢ ٦ تہیہ۔ پہلا حرف مفتوح، دوسرا مکسور، تیسرا مشدّد مفتوح بمعنی قصد، ارادہ ١٢

(۲۷)

بحر مجتث ۸ - رکنی نمبر (۱) مفاعلن فعلاتن مفاعلن فِعلن یا فِعلان یا فعلن یا فعلان

نویدِ[۱] امن ہی بیدادِ دوست جاں کے لئے
رہے نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

بلا سے[۲] گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہی
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لئے

وہ زندہ[۳] ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

رہا بلا[۴] میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

لہ نوید - یعنی خوش خبری، شعر کا مطلب یہ ہے کہ دوست کی بیداد، امن و امان کی خوش خبری ہے بیداد ہو اور اتنی ہو کہ آسمان کے لئے کوئی طرزِ ستم باقی نہ رہے ۱۲ ٹہ اگر مژگانِ یار میری خون کی پیاسی ہے تو ہوا کرے، وہ بہت خون پی چکی اب جو کچھ باقی ہے وہ اپنی خوں فشاں مژگاں کے لئے رکھوں گا ۱۲ سہ خضر کے متعلق مشہور ہے کہ وہ زندہ ہیں مگر نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ ایسی زندگی کے مقابل میں اپنی زندگی پیش کر کے کہا گیا ہے کہ ایک حیاتِ خضر ہے کہ وہ عمرِ جاوداں پا کر چوروں کی طرح چھپے پھرتے ہیں' ایک ہم ہیں کہ دنیا سے روشناس ہیں ۱۲ کہ کاش میں اکیلا مبتلائے بلا ہوتا' تیری ادا اگر بلا تھی تو صرف میرے لئے ہوتی۔ ایسا ہوتا تو بلائے رشک سے چھٹکارا ہوتا۔ مگر غضب یہ ہے کہ تیری ادا ساری دنیا کے واسطے بلائے جاں قرار پاگئی ہے اور اس لحاظ سے بقول مرزا داغ ؎

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

فلک[١] نہ دُور رکھ اُس سے مجھے کہ میں ہی نہیں — درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے

مثال[٢] یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر — کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

گدا[٣] سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے — اُٹھا، اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

بقدرِ[٤] شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل — کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

دیا ہے[٥] خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے — بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا[٦] یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

نصیرِ[٧] دولت و دیں اور معینِ ملّت و ملک — بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے

ا اے فلک تو مجھے قاتل (معشوق) سے اس لئے دُور رکھتا ہے کہ درازدستی (ظلم) سے محفوظ رہوں مگر تیرا یہ بہانہ صرف مجھے مبتلائے ہجر رکھنے کے لئے ہے ورنہ اُس کی درازدستی ظلم کے لئے تو دنیا پڑی ہے۔ وہ جس کا چاہے امتحان لے، بہرحال مجھے اُس سے دُور نہ رکھ ١٢ ٢ میری بے کار اور بے سود کوشش کی یہ مثال ہے کہ جیسے قفس میں رہ کر مرغِ اسیر آشیاں کے لئے تنکے جمع کرے، گویا قیامِ دنیا کے لئے مستقل قیام کی فکر بے نتیجہ ہے ١٢ ٣ پاسبان مجھے ایک فقیر سمجھ کر خاموش تھا مگر میری حماقت کہ میں نے اس کے قدم چھوئے جس سے وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی خاص مطلب رکھتا ہے اور اس بنا پر اُس نے بُرا سلوک کیا ١٢ ٤ یعنی غزل کا میدانِ تنگ میرے شوقِ بیان کے واسطے کافی نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ یہاں سے غزل سرائی چھوڑ کر مدح سرائی شروع کرتا ہوں، چنانچہ اس کے بعد جو اشعار ہیں وہ تجمل حسین خاں کی تعریف میں ہیں۔ تنگنا بمعنی راہ تنگ ١٢ ٥ تجمل حسین خاں، فرخ آباد کے خاندان بنگش کے ایک نواب تھے ١٢ ٦ بارِ خدایا یعنی اے خدائے بزرگ و برتر۔ صرف بارِ خدا بھی کہتے ہیں۔ نطق بمعنی گویائی۔ ١٢ ٧ نصیرالدولہ و معین الملۃ والملک، تجمل حسین خاں کے خطاب ہیں ١٢

زمانہ[1] عہد میں اُس کے ہی محوِ آرائش | بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہی | سفینہ[2] چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لئے

اداے خاص سے غالب ہوا ہی نکتہ سرا
صلاے[3] عام ہی یارانِ نکتہ داں کے لئے

در صفتِ انبہ

بحرِ خفیف ۶ - رکنی نمبر (۱) فاعلاتن مفاعلن فعْلن یا فعْلان یا فِعلن یا فِعلان

ہاں[4] دلِ دردمند زمزمہ ساز | کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامے[5] کا صفحے پر رواں ہونا | شاخِ گُل کا ہی گُل فشاں ہونا

---

[1] زمین و آسمان ممدوح کے عہد معدلت میں مصروفِ آرائش ہی اور موجودہ ستارے آرائش فلک کے لئے کافی نہیں ہیں اس لئے اور ستاروں کے بننے کی ضرورت ہی ۱۲ [2] سفینہ بمعنی کشتی - ناؤ - اور دفتر - یہاں بحرِ بے کراں (دریائے بے ساحل) کی شباہت سے سفینہ کہا گیا ہی - اگرچہ مدعائے اصلی دفتر سے ہی اور اس صفت کو ایہام کہتے ہیں یعنی ایک لفظ دو معنی میں استعمال کیا جائے اور معنی بعید مقصود ہوں - بحر کی وجہ سے معنیِ قریب کشتی کے ہوتے ہیں اور دفتر کے معنیِ بعید ہیں - لہذا وہی (بعید معنی) مقصود ہیں ۱۲ [3] صلائے عام - اشتہار عام - دعوتِ عام - خاص و عام میں صنعت تضاد ہی ۱۲ [4] زمزمہ کے معنی چُپکے چُپکے گُنگُنانے کے ہیں، اور زمزمہ اُس دعا کو بھی کہتے ہیں جو آتش پرست اپنی پرستش کے وقت پڑھتے ہیں شعر کا مطلب یہ ہی کہ دلِ دردمند زمزمہ ساز (ایسے موقع پر) خزانۂ راز کا دروازہ کیوں نہ کھولے - ہاں کا لفظ اکثر ابتدائے کلام میں اہلِ فارس بھی استعمال کرتے ہیں ۱۲ [5] خامہ بمعنی قلم - قلم کاغذ پر اس طرح چلتا ہی جیسے کہ موسم گل میں شاخ سے پھول جھڑتے ہیں ۱۲

مجھ سے کیا پوچھتا ہی کیا لکھئے ‏ — نکتہ ہائے خرد فزا[1] لکھئے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے ‏ — خامہ نخلِ رُطب[2] فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں[3] ہے ‏ — ثمر و شاخ گوئے[4] و چوگاں[5] ہے
تاک[6] کے جی میں کیوں رہے ارماں ‏ — آئے یہ گو ہی اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جاوے خاک ‏ — پھوڑتا ہی جلے پھپھولے[7] تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور ‏ — بادۂ ناب[8] بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہی ‏ — شرم سے پانی پانی ہونا ہی
مجھ سے پوچھو تمھیں خبر کیا ہی ‏ — آم کے آگے نیشکر[9] کیا ہی
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار ‏ — جب خزاں[10] آئے تب ہو اُس کی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں ‏ — جانِ شیریں[11] میں یہ مٹھاس کہاں
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی ‏ — کوہ کن[12] باوجودِ غمِ گینی
جان دینے میں اُس کو یکتا جان ‏ — پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

---

[1] خرد فزا۔ عقل بڑھانے والے ۱۲ [2] رُطَب، بضم اول و فتحہ دوم تازہ خرما یا کھجور، نخل۔ درختِ خرما اور ہر درخت کو بھی کہتے ہیں ۱۲ [3] مردِ میدان۔ بمعنی مدِّ مقابل ۱۲ [4] گوے، گیند ۱۲ [5] چوگاں۔ بلاّ ڈنڈا ۱۲ [6] تاک۔ انگور کی بیل ۱۲ [7] جلے پھپھولے پھوڑنا اُردو کا محاورہ ہی، یعنی کھسیا کر مقابلے پر آنا بے سود مقابلہ کرنا ۱۲ [8] بادۂ ناب۔ خالص شراب ۱۲ [9] نیشکر۔ گنّا ۱۲ [10] خزاں موسم بہار کے خلاف پت جھڑ کا موسم ۱۲ [11] جانِ شیریں۔ موصوف صفت ہی۔ یا فرہاد کی معشوقہ شیریں، مگر یہاں پہلے معنی زیادہ چسپاں ہیں ۱۲ [12] کوہکن۔ فرہاد ۱۲

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر — کہ دواخانۂ ازل میں مگر
آتشِ گُل[1] پہ قند کا ہے قوام — شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت[2] سے — باغبانوں نے باغِ جنت سے
انگبیں[3] کے، بحکم رب الناس[4] — بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات[5] — مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل — ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
تھا ترنج[6] زر ایک خسرو پاس — رنگ کا زرد پر کہاں بو باس

---

۱ اس شعر میں آتشِ گُل سے مراد گلاب کا پھول ہے۔ اُس کی سرخی کو آگ سے استعارہ کیا ہے۔ قوام بمعنی شیرہ۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ آم درحقیقت گلاب ہے اور اس پر شہد کا قوام کیا گیا ہے اور اُس قوام سے جو تار نکلتا ہے وہ آم کا ریشہ ہے۔ بعض شارحین کا خیال ہے کہ آتشِ گُل سے پھول کی آگ مراد ہے جس پر قوام تیار کیا گیا ہے۔ لیکن اس شرح پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ آم کی تشبیہ صرف قوام سے دینا غالب جیسے دقیقہ رس شاعر سے بعید ہے۔ جب کہ پھول کی شکل موجود ہے جس سے تشبیہ کامل ہوتی ہے ۱۲

۲ فرطِ رافت، فرط بمعنی کثرت، رافت - مہربانی ۱۲ ۳ و ۴ انگبیں بمعنی شہد۔ رب الناس - اللہ مُہر سے آموں کے ڈنٹھل کا استعارہ ہے۔ اس شعر میں عیب تعقید ہے۔ پہلے مصرع میں جو کہے ہے یہ سر بمہر گلاس سے متعلق ہے۔ اس کی نثر اس طرح ہے کہ "انگبیں کے سر بمہر گلاس بحکم خدا بھیجے ہیں ۱۲

۵ شاخِ نبات، مصری کا کوزہ یا قلم۔ جس کو خضر نے آبِ حیات سے سینچا ہے۔ آبِ حیات وہ پانی جس کو پی کر موت نہیں آتی ۱۲ ۶ ترنج، بمعنی نارنگی یا لیموں، خسرو بادشاہ فارس جس کو خسرو پرویز کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس ایک سونے کا ڈلا سا جو بشکل ترنج تھا اور وہ اس کے ہاتھ میں رہا کرتا تھا اور وہ مثل موم کے نرم ہو جاتا تھا۔ خسرو پاس - محاورہ قدیم ہے۔ اب خسرو کے پاس کہیں گے ۱۲

آم کو دیکھتا اگر اک بار — پھینک دیتا طلائے[1] دست افشار

رونقِ کارگاہِ[2] برگ و نوا — نازشِ دودمانِ[3] آب و ہوا

رہروِ راہِ خلد کا توشہ[4] — طوبیٰ و سدرہ[5] کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخ و برگ و بار[6] ہے آم — نازپروردۂ بہار ہے آم

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو — نوبرِ[7] نخلِ باغِ سلطاں ہو

وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد — عدل سے اُس کے ہے حمایتِ عہد

فخرِ دیں عزّ شان و جاہ و جلال — زینتِ طینتِ[8] و جمالِ کمال

کارفرمائے[9] دین و دولت و بخت — چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

سایہ اُس کا ہما کا سایہ ہے — خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

اے مفیضِ[10] وجودِ سایہ و نور — جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور

اس خداوندِ بندہ پرور کو — وارثِ گنج و تخت و افسر[11] کو

شاد و دل شاد و شادماں رکھیو
اور غالب پہ مہرباں رکھیو

---

۱ طلائے دست افشار۔ اُسی مذکورہ ترنج زر کو کہتے ہیں۔ دست افشار۔ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ موم کی طرح ہاتھ کے ہلانے سے دب جاتا اور پچک جاتا تھا ۱۲ ۲ کارگاہ، کارخانہ، برگ و نوا۔ کائنات ۱۲ ۳ دودمان۔ یعنی خاندان ۱۲ ۴ توشہ، یعنی زادِ راہ ۱۲ ۵ طوبیٰ اور سدرہ بہشت کے درخت ہیں ۱۲ ۶ برگ و بار۔ پتّے اور پھل ۱۲ ۷ نوبر، نیا پھل ۱۲ ۸ طینت۔ رنگ طبعی ۱۲ ۹ کار فرما۔ حاکم حکمراں ۱۲ ۱۰ مفیض یعنی فیض رساں ۱۲ ۱۱ افسر، تاج

سہرا

بحر رمل ۸ - رُکنی نمبر(۵) فاعلاتن فعلاتن فعلن یا فعلات یا فعِلن یا فعِلات

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا — باندھ شہزادے جواں بخت[۱] کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے — ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ — مجھکو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر[۲] سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی — ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی — تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینا ٹپکا — ہے رگِ ابرِ[۳] گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے — رہ گیا آن کے[۴] دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز — چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مکرر سہرا

جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے — گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

---

۱ جواں بخت - دولھا کا نام ہے جو ابو ظفر بہادر شاہ کے چھوٹے بیٹے تھے ۱۲ ۲ لمبر پرانے زمانے کا املا اور تلفظ ہے اب نمبر بولتے ہیں - نمبر چھینا - درجہ حاصل کرنا - بڑھ جانا ۱۲ ۳ دولھا کے چہرے پر گرمی کی وجہ سے جو پسینے کے قطرے جمع ہو گئے ہیں ان کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ابر نیساں، بار موتی برسا رہا ہے - سہرے کی لڑی نہیں ہے بلکہ رگِ ابر ہے - بارش کی دھار کو رگِ ابر کہا ہے ۱۲ ۴ آن کے - آکے - اب متروک الاستعمال ہے ۱۲

رخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں[1] کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار[2]
لائے گا تابِ گراں باریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

قطعۂ معذرت

بحر مضارع - ۸ رکنی نمبر (۲) مفعولُ فاعلاتُ مفاعیل فاعلن یا فاع لات

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت[3] نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

۱؎ گوہرِ غلطاں - قیمتی اور چمکیلا موتی ۱۲ ۲؎ یعنی ریشم کا تار نہیں جو موتیوں کے بوجھ کو نہ سنبھال سکے - بلکہ یہ رگِ ابرِ بہار (بارش کا تار) ہے اس لئے سہرا گراں باریِ گوہر کو اُٹھائے گا - شادی بیاہ میں سہرا کہنے کا دستور مرزا غالب کے سہرے سے پہلے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتا - لہذا کہا جا سکتا ہے کہ سہرے کے موجد غالب ہی ہوئے ۱۲ ۳؎ یعنی اپنی خوش طبعی و خوش گوئی کا اظہار منظور نہیں ۱۲

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک[1] ہی صلح کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہی یہ شرف کہ ظفر[2] کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستادِ شہ[3] سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما[4] ہی شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا — جز انبساطِ[5] خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر[6] — دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہی سخن گسترانہ[7] بات — مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا[8] نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

---

[1] مسلک بمعنی طریقہ - روش ۱۲ [2] ظفر- بہادر شاہ ابوظفر کا تخلص ہی ۱۲
[3] اُستادِ شہ - ذوق دہلوی ۱۲ [4] جامِ جہاں نما، بمعنی قلب روشن، جس کو بغیر کہے سارا حال معلوم ہو۔ مشہور ہی کہ جمشید کے عہد میں ایسا پیالہ بنایا گیا تھا جس میں نجوم وغیرہ کے حساب سے اگلے پچھلے سب حالات نظر آجاتے تھے ۱۲ [5] انبساط- مسرت- خوش کرنا ۱۲
[6] امتثال امر- حسب الحکم- فرمائش پر ۱۲ [7] سخن گسترانہ - شاعرانہ تعلّی ۱۲
[8] سودا- بمعنی خبط و جنوں - اس لفظ میں ایک لطف یہ بھی ہی کہ سودا شیخ محمد ابراہیم ذوق کے سلسلۂ شاعری میں دوسری تیسری پشت میں اُستاد تھے اور جنون و وحشت بھی غالباً اُن شعرا کے تخلص ہیں جن کو ذوق مانتے تھے ۱۲

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

ا؎ اس قطعے اور سہرے کی تاریخ یہ ہے کہ نواب زینت محل (بیگم ابو ظفر بہادر شاہ) کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا، میرزا جواں بخت اُن کے بیٹے تھے اور باوجودے کہ بہت بھائیوں سے چھوٹے تھے مگر بیگم کی خاطر سے بادشاہ اُن کی ولی عہدی کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی شادی کا موقع آیا، بڑی دھوم دھام سے سامان ہوئے۔ بیگم کے ایما سے مرزا غالبؔ نے یہ سہرا کہکر زرنگار کاغذ پر لکھکر ایک سونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلّف کے ساتھ حضور میں گزرانا بادشاہ نے جب سہرے کو ملاحظہ فرمایا تو مقطع کو دیکھکر حضور کو خیال بلکہ ملال ہوا۔ اُستاد ذوقؔ حسب معمول حضور میں گئے تو وہ سہرا دیا کہ اُستاد اسے تو دیکھو۔ اُنھوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی، پیر و مرشد! درست، بادشاہ نے کہا تم بھی ایک سہرا کہہ دو، عرض کی بہت خوب، پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو اور کہا کہ مقطع کو بھی دیکھا، عرض کی حضور دیکھا، غرض وہیں بیٹھ گئے اور ایک سہرا لکھا اور مرزا غالبؔ کے مقطع کا جواب اس طرح دیا ؎

جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سُنا دو اُن کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

ارباب نشاط حضور میں ملازم تھیں، اُسی وقت اُنھیں ملا اور شہر کی گلی گلی کوچے کوچے میں پھیل گیا۔ مرزا غالبؔ بڑے ادا شناس تھے، سمجھے کہ کیا تھا کچھ اور ہو گیا کچھ اور۔ اسی معذرت میں یہ قطعہ لکھکر حضور میں گزرانا، جس کی سب طرف تعریفیں ہوئیں ۱۲

حالاتِ حالی

ولادت و خاندان

الطاف حسین نام، حالی تخلص، شمس العلما خطاب، خاندانی لقب خواجہ تھا۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ خواجہ ملک علی اپنے عہد میں تبحرِ علمی کے لئے مشہور تھے، مولانا حالی ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء کو بمقام پانی پت ضلع کرنال محلہ انصاری میں پیدا ہوئے۔

تعلیم

ان کی تعلیم و تربیت باقاعدہ نہیں ہوئی، جس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا کی ولادت کے بعد ہی اُن کے والد ماجد عوارضِ دماغی میں مبتلا ہو گئے اور ہنوز وہ نو سال ہی کے تھے کہ اُن کے والد ماجد دنیا سے رحلت کر گئے۔ اوّل انھیں قرآنِ مجید حفظ کرایا گیا، پھر فارسی کی دو چار ابتدائی کتابیں پڑھائی گئیں، جب فارسی سے تھوڑی بہت مناسبت پیدا ہو گئی تو ان کو عربی کا شوق ہوا، مگر ابھی کتابیں تمام نہیں ہوئی تھیں کہ اُن کے سرپرستوں اور مربیوں نے ان کو شادی کرنے پر مجبور کیا، اس وقت ان کی عمر سترہ ۱۷ سال کی تھی۔ شادی ہو جانے کے بعد ان کو سب نے اس پر آمادہ کیا کہ وہ ملازمت تلاش کریں مگر تعلیم کا شوق غالب تھا بیوی کا مائکا آسودہ حال تھا، اس لئے وہ گھر والوں سے روپوش ہو کر دہلی چلے گئے یہاں ڈیڑھ برس تک انھوں نے صرف و نحو اور منطق کی کتابیں پڑھیں۔

ملازمت

۱۸۵۶ء میں اُن کو ایک قلیل تنخواہ کی اسامی کلکٹری کی دفتر میں مل گئی

مگر ۱۸۵۷؁ء میں جب غدر کا ہنگامہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی (جہاں نوکر تھے) بعض سخت واقعات ظہور پزیر ہوئے تو وہ نوکری چھوڑ کر پانی پت چلے آئے اسی زمانے میں پانی پت کے مشہور فضلا سے بغیر کسی ترتیب و نظام کے کبھی منطق اور فلسفے کی کتابیں پڑھیں اور کبھی تفسیر و حدیث کا درس لیا۔ کچھ مدت کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں اُن کو ایک جگہ مل گئی۔ اس عہدے پر جو کام انجام دینا پڑا وہ یہ تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے اُن کی عبارت محاورہ و روزمرہ کے موافق کر دیا کرتے تھے، اس کام کو دو چار برس تک کرتے رہے، پھر لاہور سے اینگلو عربک اسکول دہلی کی مدرسی پر بدل کر آئے۔ اثنائے مدرسی میں وہ لاہور کے چیفس کالج میں بھی آٹھ ماہ تک اتالیق ہو کر رہے۔ مگر چوں کہ یہ خدمت اُن کے مذاق کے موافق نہ تھی اس لئے پھر اپنی جگہ واپس آگئے۔ ۱۸۹۱؁ء ۱۳۰۹؁ھ میں جب کہ اینگلو عربک اسکول کے مدرس تھے، نواب سرآسماں جاہ مدارالمہام حیدرآباد دکن علی گڑھ کالج کے ملاحظہ کے لئے تشریف لائے، اس موقع پر مولانا بھی موجود تھے۔ نواب صاحب ممدوح نے بسلسلۂ امداد مصنفین ۷۵ رُپئے ماہوار کا وظیفہ اُن کے واسطے مقرر فرما دیا۔ اس کے بعد جب مولانا سر سید احمد خاں کے ہمراہ حیدرآباد گئے تو نواب مدارالمہام ممدوح نے اُن کے وظیفے میں ۲۵ رُپیے کا اضافہ کر کے پورے سو رُپیے کر دئیے۔ اور یہ وظیفہ آخر عمر تک جاری رہا۔

ادبی مذاق اور اُس کی خدمات

جس زمانے میں مولانا تحصیل علم کے لئے دہلی میں مقیم تھے تو اکثر مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے اور اپنے کلام کی اصلاح لیا کرتے تھے۔ پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو کی ملازمت سے

زمانے میں جب کہ اُن کو انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں اور مضامین کو درست کرنا پڑتا تھا، رفتہ رفتہ اُن کو انگریزی خیالات اور انگریزی طرزِ ادا سے مناسبت پیدا ہوگئی۔ ۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب کے ایما سے لاہور میں ایک نئے قسم کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی گئی۔ ہندوستان میں یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں بجائے مصرع طرح کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اُس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔ مولانا نے چند مثنویاں لکھکر اس مشاعرے میں پڑھی تھیں۔ جن میں چار کے نام یہ ہیں: (۱) برکھا رت۔ (۲) نشاطِ اُمید۔ (۳) مناظرۂ رحم و انصاف۔ (۴) حُبِّ وطن۔ یہ مثنویاں بہت زیادہ مقبول ہوئیں اور بار بار چھپ کر شائع ہوئیں اور اب تک اُردو کے نصابِ تعلیم میں داخل ہیں۔ انگلو عربک اسکول کی مدرسی کے زمانے میں سر سید احمد خاں نے اُن کو ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی کی حالت نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہوگی، چناں چہ اُنھوں نے اوّل مسدّس مدّ و جزرِ اسلام، لکھا۔ جو مسدّس حالی کے نام سے مشہور ہے۔ اسی کے ساتھ مولانا کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیل گئی۔ اور اب اُن کی تمام تصانیف خواہ نظم ہو یا نثر بہ نظرِ قبول دیکھی جانے لگیں۔ اسی زمانے میں آپ کا مجموعۂ کلام دیوانِ حالی، کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں ابتداءً ایک مقدمہ ہے جس میں شعر و شاعری کے متعلق نہایت خوبی سے تبصرہ کیا گیا ہے اور اُس کے تمام محاسن و معائب دکھا کر ایک ایسا دستور العمل بنا دیا ہے جو آج کل اہلِ ادب اور اربابِ ذوق کے لئے سبق آموز ہے اور جا بجا درسیات میں شامل ہے۔

تبصرہ | مولانا حالی کے کلام کی تنقید اس مختصر مضمون میں نہیں لکھی جا سکتی۔ اجمالاً

لکھا جاتا ہے کہ اُردو میں اخلاقی اور نیچرل شاعری کی ترقی کا آغاز آپ ہی سے ہوا۔ آپ کی سادگی بیان، پاکیزگی زبان، ہر مضمون اور ہر عنوان کا عنصرِ غالب ہے۔ غیر واقعہ اور خلاف فطرت مضامین سے بالکل اجتناب رہتا ہے۔ اُن کا شمار فی الحقیقۃ حکما و معلمین اخلاق و مصلحین اقوام میں ہو سکتا ہے۔ نہ عوام شعرا میں۔ نظم و نثر دونوں میں وہ یکساں قوت و قدرت رکھتے تھے۔ اُن کی تصانیف و تالیف میں 'یادگار غالب'۔ 'یادگار سعدی' اور سب سے آخری تالیف 'حیات جاوید' مشہور و معروف ہیں۔

خطاب و انتقال

۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ برطانیہ نے شمس العلما کا خطاب دیا۔ اور ستتر برس کی عمر پاکر ۱۹۱۴ء مطابق ۱۳۳۳ھ ہجری کو یہ آفتابِ علم و عمل پردۂ کفن میں بمقام پانی پت روپوش ہو گیا۔



قطعاتِ حالیؔ

(ردیف الف)

چھوٹوں کا بڑا بن جانا

بحر متقارب ۸، رکنی نمبر (۴) فعلن فعلن فعلن فع یا فاع

(۱)
چند خطوط[1] اک دانا نے — کھینچ کے یاروں سے یہ کہا
دیکھ لو ان میں جتنے ہیں خط — کوئی ہے چھوٹا کوئی بڑا
ہے کوئی؟ جو بے ہاتھ لگائے — دے یوں ہی چھوٹے خط کو بڑھا
ایک نے، جتنے خط تھے بڑے — اُٹھ کے دیا ایک اک کو مٹا
جب نہ رہا واں پیشِ نظر — خط کوئی چھوٹے خط کے سوا
دیکھا اُٹھا کر، آنکھ جدھر — تھا وہی چھوٹا وہ ہی بڑا
کل کی ہی یارو بات، کہ تھی — قوم میں باقی جان نہ ذرا
قوم میں جیسا حال ہے اب — آدمیوں کا کال نہ تھا
تھے موجود ادیبوں میں — اخطل[2] و اعشیٰ[3] کے ہمتا[4]

[1] خطوط - لکیریں ۱۲ [2] اخطل - نقطہ دار خ پہلے ہے - عرب کے ایک شاعر کا نام ۱۲
[3] اعشیٰ - یہ بھی عربی شاعر تھا ۱۲ [4] ہمتا - مثل - مانند ۱۲

منشیوں میں ایسے تھے بہت — جن پہ کہ نازاں تھی انشا[1]
شعر میں تھے اُستاد اکثر — سحر بیاں[2] اور نکتہ سرا[3]
لے گئی اُن کو آخر کار — بحرِ فنا کی موج بہا
اہلِ ہنر کا نام و نشاں — قوم میں جب باقی نہ رہا
حالی و زید و عمر[4] بنے — صاحبِ دیواں نام خدا
اب چاہو، اُستاد گنو — یا ہمیں سمجھو تم یکتا

ہم ہیں وہی ناچیز۔ مگر
کبرنا موت الکبرا[5]

قحطِ اہل اللہ

بحر مضارع ۸، رُکنی نمبر (۱) — مفعولُ فاع لاتن مفعولُ فاع لاتن

—·—·—

کل خانقاہ میں تھی حالت عجیب طاری (۲) — جو تھا سو چشمِ پُرنم، اپنا تھا یا پرایا
دنیا سے اُٹھ گئے سب جو تھے مُریدِ صادق — یہ کہکے شیخ کا دل بے ساختہ بھر آیا
ہم نے کہا: مریدی باقی رہی نہ پیری — یہ کہکے ہم بھی روئے اور اُس کو بھی رُلایا

---

[1] انشا۔ فن ادب و تحریر ۱۲ [2] جادو بیان، ایسے شاعر جن کے کلام میں جادو کا اثر ہو جس کو سُن کر سب مسحور ہو جائیں ۱۲ [3] نکتہ سرا۔ بھی شاعر کی صفت ہے۔ ۱۲ [4] مثال کے لئے فرضی نام لئے جاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں زید و عمر کے نام لئے گئے ہیں ۱۲ [5] یعنی بڑوں کی موت نے ہم کو بڑا کر دیا ۱۲

شادی قبل از بلوغ

(٣)

جب تک نہ شاہزادہ اٹھارہ سال کا ہو — تختِ پدر پہ اُس کو ممنوع[1] ہے بٹھانا
قانون ہے بنایا یہ اُن مقننوں[2] نے — عالم میں آج کل جو مانے ہوئے ہیں دانا
لیکن کریں نہ اُس کی قبل از بلوغ شادی — کہتے ہیں وہ عبث ہے قانون یہ بنانا
نزدیک اُن کے گویا بہ رغم[3] عقل و دانش — ہے کنگڈم[4] سے آساں میڈم کو بس میں لانا

حرص

(٤)

اثنائے وعظ میں ہے تکیہ کلام واعظ — قدرِ قلیل ہے سب مال و منال[5] دنیا
گویا کہ حرص اُس کی اس سے بجھی نہیں ہے — ہے جس قدر فراہم پاس اُس کے مالِ دنیا

یقین

بحر مضارع ٨، رکنی نمبر (٢) — مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاع لن

(٥)

آتی نہیں ہے شرم تجھے اے خدا پرست — دل میں کہیں نشاں نہیں تیرے یقین کا
جی میں ترے ہزاروں گزرتے ہیں وسوسے — ہوتی نہیں قبول تری ایک اگر دعا

[1] نا جائز۔ منع کیا گیا ١٢ [2] مقنن۔ قانون بنانے والا ١٢ [3] رغم۔ خلاف، مخالف ١٢
[4] kingdom ۔ سلطنت ١٢ [5] منال۔ جاگیر۔ ملک ١٢

تجھ سے ہزار مرتبہ بہتر ہے بُت پرست | جس کا یقیں ہے بہتر ے یقیں سے کہیں سوا
وہ مانگتا بتوں سے مُرادیں ہے عمر بھر | گو حاجت اُس کی اُن سے ہوئی ہے نہ ہو روا
آتا نہیں یقین میں اُس کے کبھی قصور | اُمید اُس کی روز فزوں ہے اور التجا
تو بندۂ غرض ہے وہ راضی رضا پہ ہے | وہ ہے، کہ یہ ہے بندگی؟ اے بندۂ خدا

شائستہ لوگوں کا برتاؤ سائل کے ساتھ

(٦)

عادت تھی اک فقیر کی کرتا تھا جب سوال | انگریز کے سوا نہ کسی سے تھا مانگتا
مدت تک اُس کی جب یہی دیکھی گئی روش | پوچھا کسی نے اُس سے کہ اس کا سبب ہے کیا
بولا کہ عادت اس لئے کی ہے یہ اختیار | چھُٹ جائے تا کہ مجھ سے یہ لپکا[1] سوال کا
پہلے جو بھاگوان[2] سے ملتی تھی روز بھیک | آتا تھا مانگنے میں بہت بھیک کے مزا
پر۔ جب سے ہے سوال کا اس قوم پر مدار | منت سے عجز سے کبھی ملتا نہیں ٹکا
اُمید ہے کہ مانگنے کی چھوٹ جائے لت | گر چند روز اور رہا ان سے سابقہ
آیا جواب سُن کے یہ اُس کا بہت پسند | کی آفریں اور اُس سے مخاطب نے یوں کہا
نیٹو ہیں جو کہ ملک میں تعلیم یافتہ | حق میں ترے مفید ہیں یہ اُن سے بھی سوا
انگریز اگرچہ ہندیوں کے حق میں ہیں بخیل | اہلِ وطن پہ اُن کی مگر جان ہے فدا
پر۔ جو کہ دیسیوں میں ہیں تعلیم یافتہ | دل بھائیوں پہ بھی نہیں اُن کا پسیجتا

[1] لپکا۔ لت۔ بری عادت ۱۲ [2] بھاگوان۔ سخی ۱۲

انگریز اتنے اجنبیوں سے نہیں نفور[1] — جتنے کہ یہ عزیز عزیزوں سے ہیں خفا

اہلِ غرض پہ کاٹنے کو دوڑتے ہیں یہ
شائستگی کا زہر ہے جب سے انھیں چڑھا

خودستائی

اے دل، بشر وہ کون ہے جو خودستا[2] نہیں — پر خودستائیوں کے ہیں عنواں جدا جدا
جو زیورِ خرد سے معرّا[3] ہیں سادہ لوح[4] — کرتے ہیں خوبیاں وہ بیاں اپنی برملا
جو ان سے تیز ہوش ہیں سو سو طرح سے وہ — پردے میں کرتے ہیں اسی مضمون کو ادا
کہتا ہے ایک کیسی حماقت ہوئی ہے آج — کمبل تھا ایک گھر میں سو سائل کو دے دیا
کہتا ہے دوسرا کہ گیا ہو کے منفعل — سائل کی ڈبے[5] میں میں نے دیا مال جب دکھا
پردے میں زیرکی[6] کے چھپاتا ہے بخل یہ — اور بن کے بے وقوف جتاتا ہے وہ سخا
کچھ اس لیے کہ ہم بھی انھیں میں سے ہوں شمار — اہلِ وطن کی اپنے بہت کرتے ہیں ثنا
کچھ اس لیے کہ اپنا ہو انصاف آشکار — کرتے ہیں اپنی قوم کی تنقیص[7] جا بجا
کہتا ہے ایک لاکھ نہ مانے برا کوئی — ہے عیب صاف گوئی کا ہم میں بہت بڑا
کہتا ہے ایک گُر ہے خوشامد کا وہی — پر چاہتے آدمی کو ہیں کہہ گئے ہم بُرا
دھوکا ہنر کا دے کے چھپاتا ہے عیب یہ — اور منھ سے دُرد[8] کہہ کے دکھاتا ہے وہ صفا

---

۱ نفور - یعنی متنفر - نفرت کرنے والا ۱۲ ۲ خودستا - اپنی تعریف کرنے والا ۱۲ ۳ معرّا - ننگے خالی ۱۲
۴ سادہ لوح - بے وقوف ۱۲ ۵ جھولی - فقیر کا برتن ۱۲ ۶ زیرکی - عقل مندی ۱۲ ۷ تنقیص - برائی، مذمت ۱۲
۸ دُرد - تلچھٹ، گاد ۱۲

چُپ چاپ سُن رہا ہی کوئی اپنی خوبیاں　　یعنی کہ یہ بیان ہی سب راست اور بجا
کہتا ہی اس پہ کوئی کہ سب حسنِ ظن ہی یہ　　اک خاکسار کو جو دیا تم نے یوں بڑھا
قانع[1] ہی وہ انھیں پہ ہوئے وصف جو بیاں　　اور چاہتا ہی یہ کہ ہو تعریف کچھ سوا
کہتا ہی زیدؔ۔ عمرؔ ہی شدّت سے سادہ لوح　　گنتا ہی سب کو نیک وہ، اچھا ہو یا بُرا
کہتا ہی عمرؔ۔ زیدؔ بھی کتنا ہی عیب بیں　　بد ہو کہ نیک۔ اس کی زباں سے نہیں بچا
یہ اُس کا اور وہ اس کا بیاں کرکے کوئی عیب　　ہراک ہی اپنی اپنی بڑائی نکالتا
غیبت[2] اُمید ہی کہ نہ ہوتی جہان میں　　ہوتا اگر یہ خاک کا پُتلا نہ خودستا
حالیؔ، جو پتڑے[3] کھول رہے ہیں جہان کے　　شاید کہ اس سے آپ کا ہوگا یہ مدّعا
یعنی کہ لاکھ پردوں میں کوئی چھپائے عیب　　اپنی نظر سے رہ نہیں سکتا کبھی چھپا

القصّہ جس کو دیکھئے جاہل ہو یا حکیم
آزار میں خودی کے ہی بے چارہ مبتلا

اپنی ایک ایک خوبی کو بار بار ظاہر کرنا

(۸)

گو آدمی کا حافظہ کیسا ہی ہو قوی　　پر بھول چوک ہی بشریّت کا اقتضا[4]
ہوتا ہی اُس سے کارِ نمایاں کوئی اگر　　کرتا ہی بار بار بیاں اُس کو برملا[5]

---

۱ قانع۔ قناعت کرنے والا۔ جو چیز مل جائے اس کے بعد ہوس نہ کرنے والا ۱۲ ۲ غیبت۔ بروزن جیبت (یائے معروف سے) پیٹھ پیچھے بُرائی کرنا ۱۲ ۳ پتڑے کھولنا۔ راز فاش کرنا عیب نکالنا ۱۲ ۴ مناسب حال۔ قدرتی امر ۱۲ ۵ برملا۔ اُجگرہ۔ کھلّم کھلّا ۱۲

یہ تو وہ بھولتا نہیں ہرگز کہ چاہیئے — ہر بار اپنی مدح کا پیرایہ[1] اک جدا
پر، اتفاق سے نہیں رہتا یہ اُس کو یاد — یاروں سے میں بیان ابھی کر چکا ہوں کیا
بھولے نہ اپنی یاد یہ انساں کو چاہیئے — آخر بشر کا خاصہ[2] ہے سہو اور خطا

غرورِ نیک نامی

بحرِ مجتث ۸ رُکنی نمبر (۱) — مفاعلن فعِلاتن مفاعلن فعلُن

(۹)

گئی ہے حد سے گزر شیخ کی نکو نامی — گمانِ بد کبھی اس کی طرف نہیں جاتا
جو اس کے عیب قسم سے بیاں کرے کوئی — خود اس کو عیب کا اپنے یقیں نہیں آتا

رؤسائے عہد کی فیاضی

بحرِ رمل، ۸ - رُکنی نمبر (۱) — فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلات

(۱۰)

کی رئیسِ شہر کی تعریف یاروں نے بہت — بر سبیلِ تذکرہ باہم جو ذکر اُس کا چلا
بولے آج اُس کا نہیں مہماں نوازی میں نظیر — عاملانِ شہر[3] مدعو[4] اس کے رہتے ہیں سدا
ضلع کے حکام کا ادنیٰ اشارہ چاہیئے — پھر کوئی دیکھے سخاوت اُس کی اور بذل[5] و عطا
یادگاریں جتنی ہیں اعیانِ[6] دولت کی بنیں — اُن میں صرف اُس کی رقم ہے سب کے چندے سے سوا

[1] پیرایہ - انداز - عنوان ۱۲ [2] خصوصیت، فطرت ۱۲ [3] عاملانِ شہر - حکام ۱۲
[4] مدعو - جن کی دعوت کی جائے ۱۲ [5] بذل، سخاوت ۱۲ [6] اعیان - سربرآوردہ معززین ۱۲

پالکی یا ونگینٹ ہی جو سواری اس کے پاس
اہلکاروں کے لئے ہی وقف بے چون چرا[1]
کیا کلکٹر، کیا کمشنر، کیا سپاہی، کیا عسس[2]
اُس کی ہمت کے ہیں سب مدّاح بے رو و ریا
جب یہ دیکھا ہے کہ دفتر نہیں ہوتا تمام
جوڑ کر ہاتھ اُن سے حالی نے بصد منت کہا
عیب بھی اس کا کوئی آخر کردیا رو بکار
سنتے سنتے خوبیاں جی اپنا متلانے لگا

خادم آقا کی خدمت میں کیوں گستاخ ہوجاتے ہیں

(۱۱)

کہتے ہیں خدّام ماموں[3] کے بہت گستاخ تھے
ایک دن خادم کی گستاخی یہ ماموں نے کہا
کوئی آقا جب کہ خوش اخلاق ہوتا ہے بہت
پیش خدمت اس کے بداخلاق ہوتے ہیں سدا
پر - جو سچ پوچھو تو ہونا خادموں کا شوخ چشم[4]
ہے دلیل اس کی کہ ہے خود خُلق آقا کا بُرا
کھو دیا ہیبت[5] کو اپنی جس نے اور تمکین[6] کو
اُس نے گویا ڈھا دیا رُکن[7] رکیں اخلاق کا

اپنا الزام دوسروں پر تھوپنا

(۱۲)

ٹھوٹ[8] کاری گر سے جب کوئی بگڑ جاتا ہے کام
اپنے اوزاروں کو وہ الزام دیتا ہے سدا
افسروں کا بھی یہی شیوہ ہے وقت باز پرس
اپنے ماتحتوں کے سر دیتے ہیں تھوپ اپنی خطا

---

[1] بے چون و چرا - بلا حجت ۱۲ [2] عسس - کوتوال داروغہ ۱۲ [3] بغداد کا خلیفہ ۱۲ [4] شوخ چشم - گستاخ ۱۲ [5] ہیبت بمعنی رعب ۱۲ [6] تمکین بمعنی وقار ۱۲ [7] رُکن بمعنی ستون - رکین بمعنی مضبوط - یہاں اصل الاصول سے مراد ہے ۱۲ [8] ٹھوٹ، بے وقوف - نکما ۱۲

کام اچھا کرنا چاہیئے نہ جلد

(۱۳)

کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے / اُس نے کی تاخیر اُس میں جس قدر اچھا کیا

کب کیا، کیوں کر کیا، یہ پوچھتا کوئی نہیں / بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

بُعدِ صوری مانعِ قربِ معنوی نہیں ہے

بحر ہزج ۸، رکنی نمبر (۳) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن

---

(۱۴)

حالی نے جو رہنے کے لئے شہر میں اک گھر / جا، اپنے محلّے سے کہیں دُور بنایا

جب اہلِ محلہ سے چلا ہو کے وہ رخصت / دل دردِ جدائی سے عزیزوں کا بھر آیا

ہمسایہ و احباب لگے کرنے سب افسوس / اک دوست شکایت سے سخن لب پہ یہ لایا

بلّی - کہ جو بے عقل ہے، دم دیتی ہے گھر پہ / اتنی بھی محبت تمھیں گھر سے نہیں آیا؟[۱]

حالی نے کہا، اُنس ہے چیز اور، وفا اور / بلّی نے مزا پھل کا وفا کے نہیں پایا

اُس مہر و وفا کی نہیں بلّی پہ پڑی چھینٹ / کُتّے نے ہے جس کا کہ سبق ہم کو پڑھایا

ہم غش ہیں مکینوں پہ وہ عاشق ہے مکاں کی / گھر بھول گئے ہم تو نہیں ہم کو بھلایا

گھر دل میں ہو یاروں کا تو پھر گھر ہی برابر / مشرق میں بنایا ہو کہ مغرب میں بسایا

---

[۱] حرف استفہام بمعنی کیا ۱۲

رعیّت پر نا اہل کو مسلّط کرنا

(۱۵)

ہارون[1] نے کہا، مصر لگا ہاتھ جب اُس کے — فرعون کا تھا مصر ہی نے مغز[2] چلایا
وہ خطۂ[3] ملعون تھا یہی جس کی بدولت — تھا دل میں خدائی کا خیال اُس کے سمایا
میں بھی اسے اُس باغیِ طاغی[4] کے علی الرغم — اک بندۂ بے قدر کو بخشوں گا خدایا
کہتے ہیں خصیب ایک غلامِ حبشی تھا — جس پر نہ پڑا تھا خرد و ہوش کا سایا
کی سلطنتِ مصر کی باگ اُس کے حوالے — نا اہل کے پنجے میں اہالی[5] کو پھنسایا
باڑی گئی بہ ایک برس نیل کی رو میں — یہ حادثہ آ، اُس کو کسانوں نے سنایا
فرمایا کہ روئی کی جگہ بوتے اگر اون — ہوتا نہ یہ نقصان کہ جو تم نے اٹھایا
ہارون نہ سمجھا کہ ودیعت[6] ہے خدا کی — محکوم ہے جو میری رعایا و برایا[7]
فرعون کی مانند اگر وہ بھی سمجھتا — اپنے کو خدا جس نے ہے عالم کو بنایا
جوکھوں[8] میں نہ یوں ڈالتا مخلوق کو اپنی
اک سفلۂ[9] ناکس کی بنا اس کو رعایا

۱؎ ہارون - خلیفۂ بغداد، مامون کا باپ ۱۲ ۲؎ مغز چلانا یا چلنا - احمق یا مغرور ہو جانا ۱۲ ۳؎ خِطّہ - صوبہ - ملک ۱۲ ۴؎ باغی - بغاوت کرنے والا - طاغی - مفسد ۱۲ ۵؎ اہالی جمع اہل بمعنی لائق - قابل ۱۲ ۶؎ ودیعت، بمعنی امانت خدا کی دی ہوئی چیز ۱۲ ۷؎ برایا بمعنی مخلوق - رعیت ۱۲ ۸؎ جوکھوں میں ڈالنا، یعنی مشکل میں پھنسانا ۱۲ ۹؎ سفلہ - کمینہ ۱۲

خوشامد کرنے کی ضرورت

بحرِ خفیف، ۶ رکنی نمبر (۱) فاعلاتن مفاعلن فعِلن یا فعلن

(۱۶)

متوکّل[۱] کا تیر چڑیا پر
ہو گیا اتفاق سے جو خطا
ابنِ حمدوں ندیم[۲] تھا حاضر
کی خلیفہ کی مدح اور یہ کہا
جن کو خلقِ خدا پہ شفقت ہے
خوں بہانا نہیں وہ رکھتے روا
جا نہ سکتی تھی بچ کے تیر سے وہ
تو نے دی قصداً اُس کی جان بچا
ابنِ حمدوں نے کی یہ دانائی
کہ خوشامد سے یوں اُسے پھُسکا
دُور تھا ورنہ کیا خلیفہ سے
ہٹ کے اپنی خطا سے کھسیانا
جاے کُنجشک[۳] ابنِ حمدوں پر
تیر کا اپنے امتحاں کرتا
ابنِ حمدوں کی جان گو جاتی
دل تو ہوتا خلیفہ کا ٹھنڈا

قانون

بحرِ رمل ۶ - رکنی نمبر (۴) فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

(۱۷)

کہتے ہیں ہر فردِ انساں پر یہی فرض
ماننا قانون کا بعد از خدا
پر - جو سچ پوچھو نہیں قانون ہیں
جان کچھ مکڑی کے جالے کے سوا

۱؎ خلفاے عباسیہ - یعنی بغداد کا ایک خلیفہ ۱۲ ۲؎ ندیم مصاحب ۱۲ ۳؎ کنجشک - چڑیا - پرند ۱۲

اُس میں پھنس جاتے ہیں جو کم زور ہیں — اور ہلا سکتے نہیں کچھ دست و پا
پر۔ اُسے دیتے ہیں توڑ اک آن میں — جو سکت رکھتے ہیں ہاتھوں میں ذرا
حق میں کم زوروں کے ہے قانون وہ[۱]
اور نظر میں زورمندوں کے ہے لا

انسان جو اشرف المخلوقات ہے سب سے زیادہ موردِ آفات ہے

(۱۴)

دل پہ جو کیفیتیں ہیں ناگوار — دو ہیں اُن میں سے نہایت جاں گزا
ایک، فکر اُس آنے والے وقت کی — شک نہیں ہے جس کے آنے میں ذرا
دوسرے، چوٹیں زبانِ خلق کی — زخم جن کا زخم ہے تلوار کا
اور بھی حیوانِ ناطق[۲] کے لئے — ہیں بہت سی زحمتیں ان کے سوا
پر گدھے، اور۔ اور حیوانات سب — رہتے ہیں دُوران گزندوں[۳] سے سوا
کیسا ان آلام[۴] سے رہتا نچنت[۵] ہے
اشرف المخلوق[۶] اگر ہوتا گدھا

---

۱ (Law) بمعنی قانون۔ اور عربی کا حرفِ نفی۔ یعنی کچھ نہیں ۱۲
۲ حیوانِ ناطق۔ انسان، بولنے والا ذی روح ۱۲ ۳ گزند۔ نقصان ۱۲
۴ آلام۔ الم کی جمع بمعنی رنج ۱۲ ۵ نچنت، بے فکر۔ جدا ۱۲ ۶ اشرف المخلوق۔ یعنی تمام مخلوقات سے افضل (انسان) ۱۲

ردیف (ن)

ایک خود پسند امیر زادے کی تضحیک

(۱۹)

بحر خفیف ۶ رکنی نمبر (۱) — فاعلاتن مفاعلن فعلن یا فعِلن

کہتے ہیں اک امیر زادے کو
تھا خدنگ[1] افگنی کا شوق کہیں

خصلتیں جو امیر زادوں میں
لازمی ہیں، وہ اُس میں بھی سب تھیں

گو کہ رکھتا نہ تھا ہُنر کوئی
اس پہ تھا خود پسند[2] اور خود بیں

کچھ نہ تھا پر سمجھتا تھا سب کچھ
علم تیر و کماں میں اپنے تئیں

واہ واہ سُنتے سُنتے یاروں کی
ہو گیا تھا ہُنر کا اپنے یقیں

الغرض ایک روز صحرا میں
جب کہ تھے ساتھ سب جلیس و قریں

مشقِ تیر افگنی میں تھا مصروف
کر رہے تھے خوشامدی تحسیں

آ کے دیکھا جو اک ظریف نے حال
وجہِ تحسیں ہوئی نہ ذہن نشیں

تیر جتنے کمان سے چھوٹے
پائے سب بے اصول و بے آئیں[3]

جا کے بھولے سے بھی نہ پڑتا تھا
تیر آماج گہ[4] کے کوئی قریں

ایک جاتا تھا چھٹ کے سوئے شمال
ایک جاتا تھا پھٹ کے سوئے یمیں[5]

کچھ جو شوخی ظریف کو سوجھی
رکھ کے بالائے[6] طاق سب تمکیں[7]

[1] خدنگ، یعنی تیر ۱۲ [2] خود پسند، اپنی تعریف چاہنے والا ۱۲ [3] آئین، قانون، ضابطہ ۱۲ [4] آماج گاہ یا گہ۔ نشانے کی جگہ۔ نشانہ ۱۲ [5] یمیں۔ سیدھی طرف ۱۲ [6] بالائے طاق۔ یعنی چھوڑ دینا۔ الگ کر دینا ۱۲ [7] تمکین۔ وقار و عزت ۱۲

خاک تو دے یہ جا کے ہو بیٹھا — لوگ کرتے رہے چنان و چنیں
ناوک[1] انداز بولا چلّا کر — کوئی تجھ کو جنوں ہے اے مسکیں
یا خفا ہو کے گھر سے آیا ہے — یا کہ دو بھر ہی تجھ کو جانِ حزیں
عرض کی چارہ کیا ہے اس کے سوا — جب کہ جائے گریز[2] ہو نہ کہیں
زد سے ان بے پناہ تیروں کی — کہیں جاں دار کو امان نہیں
مجھ کو ہر پھر کے شش جہت[3] میں حضور
امن کی اک جگہ ملی ہے یہیں

سیّد احمد خاں کی مخالفت کی وجہ

بحر رمل، ۸ رکنی نمبر (۱) — فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

(۲۰)

سیّد احمد خاں کے اک منکر سے یہ پوچھا کہ آپ — کس لیے سیّد سے صاف اے حضرت والا نہیں
کافر و ملحد ہمیشہ اُس کو ٹھہراتے ہیں آپ — ثابت اسلام اُس کا نزدیک آپ کے گویا نہیں
آپ بھی نامِ خدا ہیں تارکِ[4] صوم و صلات — اور سلوکِ اسلام سے خود آپ کا اچّھا نہیں
خود نبوّت پر سُنے ہیں ہم نے ایراد[5] آپ کے — اور الوہیت[6] سے بھی دل جمع حضرت کا نہیں
چشمِ بد دور آپ کا بھی جب کہ ہے مشرب[7] وسیع — پھر یہ سیّد پر تبرّا[8] آپ کو زیبا نہیں

---

[1] ناوک بمعنی تیر ۱۲ [2] گریز - بچاؤ ۱۲ [3] شش جہت - چھ سمتیں - دائیں، بائیں، آگے پیچھے اوپر نیچے ۱۲ [4] تارکِ صوم، روزہ نہ رکھنے والا ۱۲ [5] ایراد - اعتراض، رد کرنا ۱۲ [6] الوہیت بمعنی خدائی ۱۲ [7] مشرب - مذہب طریقہ ۱۲ [8] تبرّا - بُرا کہنا ۱۲

سن کے فرمایا اگر ہو پوچھتے انصاف سے
بات یہ ہی سن لو صاحب تم سے کچھ پردہ نہیں
رنج کچھ اس کا نہیں مجھ کو کہ وہ ایسا ہی کیوں
بلکہ ساری کوفت ہے اس کی کہ "میں" یا "تو" نہیں

نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام

(۲۱)

ایک آقا تھا ہمیشہ نوکروں پر سخت گیر[۱]
درگزر تھی اور نہ ساتھ اُن کے رعایت تھی کہیں
بے سزا کوئی خطا ہوتی نہ تھی اُن کی معاف
کام سے مہلت کبھی ملتی نہ تھی اُن کے تئیں
حسنِ خدمت[۲] پر اضافہ یا صلہ تو درکنار
ذکر کیا نکلے جو چھوٹے منھ سے اُس کے آفریں
پاتے تھے آقا کو وہ، ہوتے تھے جب اُس سے دوچار
نتھنے پھولے، مُنھ چڑھا، ماتھے پہ بل، ابرو پہ چیں
تھی نہ جز تنخواہ نوکر کے لیے کوئی فتوح[۳]
آگے ہو جاتے تھے خائن[۴] جو کہ ہوتے تھے امیں[۵]
رہتا تھا اک اک شرائط نامہ ہر نوکر کے پاس
فرض جس میں نوکر اور آقا کے ہوتے تھے تعین[۶]
گر رعایت کا کبھی ہوتا تھا کوئی خواستگار
زہر کے پیتا تھا گھونٹ آخر بجائے انگبیں[۷]
حکم ہوتا تھا شرائط نامہ دکھلاؤ ہمیں
تا کہ یہ درخواست دیکھیں واجبی ہے یا نہیں
واں سوا تنخواہ کے، تھا جس کا آقا ذمہ دار
تھیں گریں[۸] جتنی وہ ساری نوکروں کے ذمے تھیں

---

۱ سخت گیر - ضدی، بدمزاج ۱۲ ۲ حُسنِ خدمت، اچھا کام ۱۲ ۳ فتوح، فائدہ، زاید آمدنی ۱۲
۴ خائن - خیانت کرنے والا ۱۲ ۵ امین - خیانت نہ کرنے والا، امانت دار ۱۲ ۶ تعین - مقرر شدہ ۱۲ ۷ انگبیں - شہد ۱۲ ۸ گر - اُردو کا لفظ ہے، شاخسانہ، جرمانہ، تاوان ۱۲

دیکھکر کاغذ کو ہو جاتے تھے نوکر لاجواب
تھے مگر وہ سب کے سب آقا کے مارِ آستیں[۱]

ایک دن آقا تھا اک مُنھ زور گھوڑے پر سوار
تھک گئے جب زور کرتے کرتے دستِ نازنیں

دفعتہً قابو سے باہر ہو کے بھاگا راہوار[۲]
اور گرا اسوار، صدرِ زیں سے[۳] بالائے زمیں

کی بہت کوشش نہ چھوٹی پانوں سے لیکن رکاب
کی نظر سائیس کی جانب کہ ہو آ کر معیں[۴]

تھا مگر سائیس ایسا سنگدل اور بے وفا
دیکھتا تھا اور ٹس سے مس نہ ہوتا تھا لعیں

دُور ہی سے تھا اُسے کاغذ دکھا کر کہہ رہا
دیکھ لو سرکار اس میں شرط یہ لکھی نہیں

رشک

(۲۲)

ظاہرا مردوں کی طینت میں نہیں رشک اس قدر
ہے طبیعت میں وہ جتنا عورتوں کی جاگزیں[۵]

ایک شہزادی کہ اکلوتی تھی جو ماں باپ کی
تختِ شاہی پر ہوئی بعد از پدر مسند نشیں

سلطنت میں اُس کی۔ تھا مردوں کو کُلّی اختیار
عورتیں اصلا دخیل اُس کی حکومت میں نہ تھیں

تھے وہی تھے اُس کے محرم، مرد ہی اُس کے مشیر
تھا نہ عورت کا پتا دربار میں اُس کے کہیں

تخلیے میں ایک دن جب چند حاضر تھے ندیم
ہنس کے فرمایا کہ اے دولت کے ارکانِ رکیں

مرد ہونے کے سبب تم سے نہیں مانوس میں
بلکہ ہے اُنس اس لیئے تم سے کہ تم عورت نہیں

---

[۱] مارِ آستیں۔ دوست نما دشمن ۱۲ [۲] راہوار۔ گھوڑا ۱۲ [۳] صدرِ زیں سے گرنا۔ یعنی کاٹھی سے نیچے آنا ۱۲ [۴] معین۔ مددگار ۱۲ [۵] جاگزیں۔ دل نشیں، جگہ کیے ہوئے ۱۲

بات کی حُسنِ بیاں سے اُس نے دی صورت بدل
تاکہ کوئی سوءِ ظن اُس پہ نہ کر بیٹھے کہیں

ورنہ یوں کہتی کہ ہے عورت کی سیرت سے مجھے
اس لئے نفرت، کہ ہے مردوں کی صورت دلنشیں

گدائے مُبرِمؔ[۱]

(۲۳)

اک برہمن مورتی کے سامنے با صد نیاز
مانگتا تھا ہاتھ پھیلائے دعا بیٹھا کہیں

آن نکلا بانوا[۲] اک مانگتا کھاتا اُدھر
دیکھ محویّت برہمن کی گیا بس جم وہیں

جی میں آیا چھیڑ کر قائل برہمن کو کرے
تاکہ پوچھے کچھ نہ کچھ یاروں کو ہو کر شرمگیں

مورتی کے سامنے جب کر چکا وہ التجا
بانوا بولا کہ ہے تو بھی عجب کوتاہ بیں[۳]

مورتی کچھ تجھ کو دے گی اور نہ دے سکتی ہے وہ
ناحق اتنی التجائیں اُس کے آگے تو نے کیں

ہنس کے برہم[۴] نے کہا، ہے مانگنا بندے کا کام
دے نہ دے وہ، اس سے کچھ مطلب نہیں اپنے تئیں

ہم نہیں دیتے ڈھئی[۵] تم جیسے ڈھیٹوں[۶] کی طرح
ہاتھ پھیلاتے ہیں لیکن پاؤں پھیلاتے نہیں

---

[۱] گدائے مُبرِم۔ ضدی فقیر ۱۲ [۲] بانوا۔ مالدار ۱۲ [۳] کوتاہ بیں۔ کم دیکھنے والا بے عقل ۱۲
[۴] برہم۔ برہمن کا مخفف ۱۲ [۵] ڈھئی دینا۔ اردو کا محاورہ، یعنی ایک جگہ جم کر بیٹھ جانا ۱۲
[۶] ڈھیٹ، بمعنی بے حیا ۱۲

عقل اور نفس کی گفتگو

بحرِ رمل ۸ رکنی نمبر (۲) — فاعلاتن فِعلاتن فِعلاتن فعلن

(۲۴)

نفس کو عقل نے چاہا کہ کرے خوار و زبوں[1] — اپنے دعووں پہ بیاں کر کے دلیل و برہاں[2]
کہا اے نفس نہیں تجھ میں مآل اندیشی[3] — درد ہیں تیرے اسی واسطے سب بے درماں[4]
سود[5] سے کچھ تجھے رغبت نہ زیاں[6] سے پرہیز — تیرے نزدیک ہے درد اور دوا سب یکساں
نہیں غفلت میں تجھے دین نہ دنیا کی خبر — یہ بھی ہے نیند کوئی۔ موت کا ہے جس پہ گماں
نہ جوانی میں تجھے صبر نہ پیری میں شکیب[7] — کبھی ہوتا نہیں کم تیری خودی[8] کا طوفاں
کہیں جائے نہ بھٹک منزلِ مقصود سے تو — دیکھ۔ جاتا ہے کدھر اور تجھے جانا ہے کہاں
ہاتھ دھو لذتِ فانی سے، نہیں گر منظور — عیشِ باقی و حیاتِ ابدی سے حرماں[9]
نفس نے عقل سے کی عرض کہ اے خضرِ طریق[10] — وعظ پر تیرے ہے زیبا کہ فدا کیجیے جاں
پر، نہیں حکم ترا کوئی عمل کے قابل — گو کہ حکمت سے بھرا تیرا سراسر ہے بیاں
چھوڑنا نقد کو اور نسیہ[11] کی رکھنی امید — کوئی تسلیم کرے گا نہ اسے جز ناداں
ہے یہ ایک ایک مری لذتِ فانی وہ بلا — سو حیاتِ ابدی تیری ہیں جس پر قرباں

۱؎ زبوں، بمعنی ذلیل و خوار ۱۲ ۲؎ برہان - دلیل - ثبوت ۱۲ ۳؎ مآل اندیشی - انجام بینی ۱۲
۴؎ درماں - علاج ۱۲ ۵؎ سود، فائدہ ۱۲ ۶؎ زیاں - نقصان - گھاٹا ۱۲ ۷؎ شکیب - صبر و تحمل ۱۲
۸؎ خودی - غرور ۱۲ ۹؎ حرماں - ناامیدی - یاس ۱۲ ۱۰؎ خضرِ طریق - راہ نما ۱۲ ۱۱؎ نسیہ بکسر نون - ادھار - نقد کی ضد ۱۲

ایک اب بھوک سے کہتا ہی کہ اے قاطعِ طعام
ایک مدعو اُسے کرتا ہی پس از سالِ رواں

کیوں کرے امید یہ اک مائدۂ[۱] نعمت کی
سال بھر صبر کرے گرسنگی[۲] میں انساں

عقل نے سن کے کہا خوف ہی تجھ سے اے نفس
جُربزہ[۳] تیرا تجھے دیکھئے پہنچائے کہاں

حق کے پیرائے میں ہوتا نہیں باطل سرسبز
کیجئے لاکھ بیاں اُس پہ دلیل و برہاں

جاں بلب بھوک سے ہو گرسنہ بالفرض اگر
زہر دانستہ کرے نوش نہیں یہ امکاں

نہ کہیں بھوک میں کھا بیٹھیو یہ لقمۂ نقد
اس کے کھانے میں نہیں جان کی خیر اے نادان

شعرا کو سلطنت میں دخل دینا

بحر رمل، ۶ رکنی نمبر (۴) فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

(۲۵)

سنتے ہیں یہ اک مدبّر کی ہی رائے
چاہئے گر رونقِ علم زباں

شاعروں کو سلطنت کا کیجے رکن
جن پہ اس کی سب رکانیں[۴] ہیں عیاں

رائے صائب ہی بظاہر اور متین[۵]
گو کیا اس کا نہیں کچھ امتحاں

[۱] مائدۂ نعمت - خوانِ نعمت ۱۲ [۲] گرسنگی - بھوک ۱۲ [۳] جُربزہ - گُربز کا معرّب - بمعنی فریب دینے والا - عیّار - چالاک - معرّب اس کو کہتے ہیں کہ دوسری زبان سے کوئی لفظ عربی میں تغیر حروف لے لیا جائے - عربی میں کاف اور گاف کے بدلے میں ج اور پ کے عوض میں ب کا تبادلہ کیا گیا ہی - گربزی چالاکی کے معنی میں عام طور سے اُردو میں بولا جاتا ہی ۱۲ [۴] رکانیں - ڈھنگ - طریقے - اُردو کا لفظ ہی ۱۲ [۵] متین - سنجیدہ - مضبوط ۱۲

شعر و انشا کو تو ہو شاید فروغ[1] | ہو بہت کم بر خلاف اس کے گماں
سلطنت کا پر خدا حافظ ہے۔ جب | شاعروں کے ہاتھ ہو اُس کی عناں
اور جو وہ شاعر ہیں ہندستان کے | شعر و انشا کو بھی ہے خوفِ زیاں
ایک پر اُن میں سے چل سکتا نہیں | دوسرے کا جادوئے حسنِ بیاں

ایک جب چلنے نہ دے گا ایک کی
پھر ترقی شعر و انشا کی کہاں

ردیف (ی)

مشاعرے کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر

بحرِ رمل، ۸ رکنی نمبر (۶) فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن یا فعِلن

(۲۶)

ہو گئی ریعانِ[2] جوانی کی بہار آخر حیف | طبعِ رنگیں تھی ہمیں عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی، جو عشق کا کرتے تھے بیاں | جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی[3]
اب، کہ الفت ہے نہ چاہت، نہ جوانی نہ اُمنگ | سر ہے سودا سے تہی، عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھیے تو کیا لکھیے غزل میں آخر | نہ رہی چیز وہ مضمون سجھانے والی
آپ بیتی نہ ہو جو، ہے وہ کہانی بے لطف | گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی

[1] فروغ۔ ترقی۔ بلندی ۱۲ [2] ریعانِ جوانی۔ ابتدائے شباب ۱۲ [3] حالی۔ حسب حال ۱۲

ہاں مگر کیجیے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں | لایئے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچیے وصلِ صنم کی کبھی فرضی تصویر | کیجیے دردِ جدائی کی کبھی نقالی
تاکہ بھڑکائے جوانوں کے دل آتش کی طرح | وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی

پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل
"قحبہ[۱] چوں پیر شود پیشہ کند دلالی"

سچ کہاں ہے

(۲۷)

دیکھنے ہوں تمھیں گر جھوٹ کے انبار[۲] لگے | دیکھ لو جا کے خزانوں میں کتب خانوں کے
سچ کو تحریروں میں پاؤ گے نہ تقریروں میں | سچ کہیں ہے تو وہ سینوں میں ہے انسانوں کے

نکتہ چینی

بحرِ رمل، ۸ رکنی نمبر (۱) فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

(۲۸)

باپ نے بیٹے کو سمجھایا کہ علم و فضل میں | جس طرح بن آئے بیٹا نام پیدا کیجیے
کیجیے تصنیف و تالیف میں سعیِ بلیغ[۳] | اس میں ایک اپنا پسینا اور لہو کر دیجیے
دیجیے معنی کے نظم و نثر میں دریا بہا | اور سخن کی داد ہر پیر و جواں سے لیجیے

اور نہ ہو گر شعر و انشا کی لیاقت آپ میں
شاعروں اور منشیوں پر نکتہ چینی کیجیے

۱؎ یہ فارسی مثل یعنی جب زنِ بازاری (فاحشہ) بوڑھی ہو جاتی ہے تو دلالی کا پیشہ اختیار کر لیتی ہے ۱۲
۲؎ انبار - ڈھیر - ذخیرہ ۱۲ ۳؎ سعیِ بلیغ - پوری کوشش و تدبیر ۱۲

سیّد احمد خاں کی تکفیر

(۲۹)

مختلف اقوال ہیں اسلام کی تعریف میں / بعض کے نزدیک توحید اُس کی حدِّ تام[1] ہے
ہے مگر جمہور کے نزدیک یہ مردود قول / جو ہیں قائل اس کے اُن پر کفر کا الزام ہے
کیونکہ اس سے ماننا پڑتا ہے اُس رحمت کو عام / جس سے غیر از اہلِ قبلہ[2] جو ہے وہ ناکام ہے
بعض کہتے ہیں کہ شر سے تیرے سب ایمن[3] رہیں / بس مسلمانی و دینداری اسی کا نام ہے
پر یہ حد بھی جامع و مانع[4] نہیں عند الفحول[5] / کہتے ہیں اسلام جو سمجھے اسے وہ خام ہے
ایمنی کا مستحق ہے خاص کر اپنا گروہ / اور "سب" کا لفظ یار اغیار سب کو عام ہے
بعض کہتے ہیں شعار اسلامیوں کا ہے لباس / جو لباسِ غیر پہنے خارج از اسلام ہے
بعض بتلاتے ہیں کچھ اور بعض فرماتے ہیں کچھ / حصر کرنا ان تمام آرا[6] کو مشکل کام ہے
مذہبِ منصور[7] ہے لیکن بیان کرنا ضرور / جو مسلّم آج کل نزدیکِ خاص و عام ہے

اہلِ حل و عقد[8] ہیں اب متّفق اس رائے پر
سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

۱؎ حدِّ تام۔ انتہائی حد ۱۲ ۲؎ اہلِ قبلہ۔ مسلمان ۱۲ ۳؎ ایمن۔ بے خوف۔ امن و پناہ میں ۱۲ ۴؎ جامع و مانع بمعنی مکمل۔ درست ۱۲ ۵؎ عند الفحول۔ علما و حکما کے نزدیک ۱۲ ۶؎ آرا۔ جمع رائے کی ۱۲
۷؎ مذہبِ منصور۔ قولِ فیصل ۱۲ ۸؎ اہلِ حلّ و عقد۔ حکّام اعلیٰ۔ فیصلہ کرنے والے۔ قاضی و مفتی ۱۲

انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی

(۳۰)

کہتے ہیں: آزاد ہو جاتا ہے، جب لیتا ہے سانس
یاں غلام آکر۔ کرامت ہے یہ انگلستان کی
اُس کی سرحد میں غلاموں نے جنھیں رکھا قدم
اور کٹ کر پاؤں سے ایک ایک کے بیڑی گری
قلبِ[1] ماہیت میں انگلستان ہے گر کیمیا
کم نہیں کچھ قلبِ ماہیت میں ہندستان بھی
آن کر آزادیاں آزاد رہ سکتا نہیں
وہ رہے ہو کر غلام۔ اس کی ہوا جس کو لگی

صفائی نہ رکھنے کا عذر

(۳۱)

راہ سے گزرا کہیں میلا کچیلا اک غلام
اُس کے میلے پن پہ لوگوں نے ملامت اُس کو کی
غرض کی، ایک اک رُواں ہو جس بدن کا مِلکِ غیر
اختیار اُس کی صفائی کا نہیں رکھتے، رہی
جو ہیں آزاد اور صفائی کا نہیں رکھتے خیال
عذر میلے پن کا شاید وہ بھی رکھتے ہوں یہی
کیوں کہ جسمِ آدمی میں پیشِ اہلِ معرفت
کوئی چیز اُس کی نہیں، سب ہے امانت گور کی

---

[1] قلبِ ماہیت۔ یعنی اصل صورت کو بدل دینا۔ کایا پلٹ ۱۲ ؎۲ رہی۔ بکسر (ر) غلام ۱۲

عادت کا غلبہ عقل پر

(۳۲)

دیکھ عادت کا تسلّط ہیں نے عادت سے کہا
گھیر لی عقلِ صواب اندیش کی سب تو نے جائے
ہنس کے عادت نے کہا۔ کیا عقل ہی مجھ سے الگ
میں ہی بن جاتی ہوں ناداں رفتہ رفتہ عقل و رائے

سیّد احمد خاں کی تصانیف کی تردید

بحر مضارع، ۸ رُکنی نمبر (۲) مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاعلن

(۳۳)

اک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے
برسوں رہا تلاش میں وجہِ معاش کی
وہ شہر شہر نوکری کی ٹوہ میں پھرا
لیکن نہ اُس کے ہاتھ کہیں نوکری لگی
اخبار بھی نکال کے بخت آزمائی کی
تدبیر یہ بھی اُس کی نہ تقدیر سے چلی
روزی کی خاطر اُس نے کئے سیکڑوں جتن[1]
پر۔ کی کہیں نصیب نے اُس کے نہ یاوری[2]
راہِ طلب میں جب ہوئی سرگشتگی[3] بہت
اک خضرِ پی خجستہ[4] نے کی آ کے رہبری
جھک کر کہا یہ کان میں اُس کے کہ آج کل
سنتا ہوں چھپ رہی ہے تصانیفِ احمدی[5]
جا۔ اور لفظ لفظ کو اُس کے چھیڑ[6] کر
تردید اُس کی چھاپ دے جو ہو بُری بھلی
پھر دیکھنا کہ اس وچپ و گرد و پیش سے
لگتی ہے کیسی آ کے زر و سیم کی جھڑی
دنیا طلب کو چاہیے ابلہ فریب[7] ہو
دنیا یہ جب تلک کہ مسلّط ہے ابلہی

---

[1] جتن۔ کوشش۔ تدبیر ۱۲ [2] یاوری۔ مدد ۱۲ [3] سرگشتگی۔ حیرانی و پریشانی ۱۲ [4] پی خجستہ۔ مبارک قدم ۱۲ [5] تصانیف احمدی۔ سید احمد خاں کی تصنیفیں ۱۲ [6] چھیڑنا۔ پارہ پارہ کرنا ۱۲ [7] ابلہ فریب بے وقوفوں کو چکمہ دینے والا۔ چالاک ۱۲

استفادہ[1]

بحرِ رجز۔ ۸ رکنی نمبر (۳) مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن

(۳۴)

لیجئے بھیک دوڑ کر، گر ہے گداگری کا یہ | جس سے ملے، جہاں ملے، جو ملے اور جب ملے
ہے یہی اصلِ اکتساب[2] ہو جیئے سب سے مستفید | زک[3] ملے، یا سزا ملے، درس ملے، ادب ملے

بے اعتدالی

بحرِ متقارب۔ ۸ رکنی نمبر (۱) فعولن فعولن فعولن فعولن

(۳۵)

تم اے خود پرستو،[4] طبیعت کے بندو | ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے
نہیں کام کا تم کو اندازہ ہرگز | جدھر ڈھل گئے ہو رہے بس اُدھر کے
جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت | تو چیخ اٹھے وہ دن میں ہمسائے گھر کے
جو مجرے پہ بیٹھو تو اٹھو نہ جب تک | کہ اٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کر کے
اگر پل پڑے جو سرا اور گنجفے پر | تو فرصت ملے شاید اب تم کو مر کے
پڑا مرغ بازی کا لپکا تو جانو | کہ بس ٹھن گئے عزمِ جنگِ تتر[5] کے

---

[1] استفادہ۔ فائدہ حاصل کرنا ۱۲ [2] اکتساب۔ حاصل کرنا۔ پیدا کرنا اپنی محنت سے ۱۲
[3] زک۔ بمعنی نقصان۔ خسارہ ۱۲ [4] خود پرستو۔ مغرور۔ شیخی باز ۱۲
[5] تتر۔ تاتار کا مخفف ۱۲

چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پہ | تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے
جو ہے تم کو کھانے کا چسکا تو سمجھو | کہ چھوڑیں گے اب آپ دوزخ کو بھر کے
جو پینے پہ آؤ تو پی جاؤ اتنی | رہیں پاؤں کے ہوش جس میں نہ سر کے

جو کھانا تو بے حد جو پینا تو ات گت
غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے[1]

پولیٹکل اسپیچیں

بحرِ ہزج، ۸ رکنی نمبر (۳) مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

(۳۶)

اے بزمِ سفیرانِ دول کے سخن آرا | ہر خرد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہے
یہ سچ ہے کہ جادو ہے بیاں میں ترے لیکن | کچھ سحر بیانی کا تری رنگ نیا ہے
ظاہر ہے نہ غصے میں بیاں سے ترے رنجش | نے لطف میں کچھ طرزِ بیاں اس سے جدا ہے
ہے دل میں نہاں ایک شکایات کا طومار | اور لب پہ جو دیکھو تو نہ شکوہ نہ گلا ہے
جو صلح کی باتیں ہیں وہ ہیں شہد سے شیریں | اور جنگ میں کچھ لطفِ سخن اس سے سوا ہے
گر سوچیے تو سیکڑوں پہلو ہیں مفر[2] کے | اور سنیے تو زنجیروں سے ہر قول بندھا ہے
دل کی ترے ہوتی نہیں معلوم کوئی بات | گو نگا نہیں، گویا نہیں کیا جانیے کیا ہے

---

[1] یعنی پیٹ بھر کے احمق - احمق کا لفظ اکثر اس مقام پر حذف کر دیتے ہیں، گویا مخاطب کے سوا کسی پر اُس کی حماقت ظاہر کرنی نہیں چاہتے ۱۲ [2] مفر - بچاؤ - بھاگنے کی جگہ ۱۲

کھلتا نہیں کچھ اس کے سوا تیرے بیاں سے
اک مرغ ہی خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے

تھے لب پہ اظہار یہ اسباب کے کھلا یہ
انسان کو اخفا کے لئے نطق[1] ملا ہے

تفاخر سے نفرت کرنے پر تفاخر

(۳۷)

زاہد نے کہا: "زینت و اسباب پہ جو لوگ
اتراتے ہیں۔ اک آنکھ مجھے وہ نہیں بھاتے"

حالی نے کہا: "جن کو ہے اترانے سے نفرت
اترا کے وہ اس طرح نہیں ناک چڑھاتے"

۱ے نطق۔ گویائی ۱۲

رباعیاتِ حالی

ردیف (الف)

(۱)

توحید

مفعول مفاعلن مفاعیلن فع یا فاع

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا
حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھ کو۔ جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

(۲)

توحید

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغاں[۱] نے راگ گایا تیرا
دہری[۲] نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

(۳)

نعت

زہاد[۳] کو تو نے محوِ تمجید[۴] کیا
عشاق کو مستِ لذتِ دید کیا
طاعت میں رہا نہ حق کا ساجھی کوئی
توحید کو تو نے آکے توحید کیا

۱؎ مغاں۔ آتش پرستوں کا گرو۔ پیشوا ۱۲ ۲؎ دہری۔ دہریہ جو خدا کا قائل نہیں ۱۲
۳؎ زہاد۔ جمع زاہد بمعنی پرہیزگار ۱۲ ۴؎ تمجید۔ اللہ کی بڑائی کرنا ۱۲

(۴)

نعت

بطحائے[1] عرب کو محترم تو نے کیا | اور اُمیّوں[2] کو خیرِ اُمم[3] تو نے کیا
اسلام نے ایک کر دیا روم و تتار | بچھڑے ہوئے گلّے کو بہم تو نے کیا

(۵)

عشق

ہے عشق طبیبِ دل کے بیماروں کا | یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے پہ اتنی ہے خبر | اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

(۶)

مُسرف کو کیوں کر فراغت ہو سکتی ہے

اک منعم[4] مُسرف[5] نے یہ عابد سے کہا | کر میرے لئے حق سے فراغت کی دعا
عابد نے کہا یہ ہاتھ اُٹھا کر سوئے چرخ | محتاج کر اس کو جلد اے بارِ خدا

(۷)

تقاضائے سن

حالیؔ کو جو کل فسردہ خاطر پایا | پوچھا باعث تو ہنس کے یہ فرمایا
رکھو نہ اب اگلی صحبتوں کی اُمّید | وہ وقت گئے اب اور موسم آیا

---

[1] بطحا کے معنی اُس کشادہ زمین کے ہیں جو پانی کی گزرگاہ ہو اور وہاں سنگ ریزے بہت ہوں مکّہ معظمہ کو بھی کہتے ہیں ۱۲ [2] اُمّی - جاہل - اَن پڑھ ۱۲ [3] خیرِ اُمم - اُمّتوں میں اچھی اُمّت - مسلمانوں کا لقب ہے ۱۲ [4] منعم - مالدار، [5] مسرف - فضول خرچ ۱۲

(۸)

نفاق کی علامت

ہر بزم میں آفریں کے لائق ہونا
شیریں سخنی سے شہد[1] فائق ہونا
ممکن نہیں، جب تک کہ نہ ہو دل میں نفاق
آساں نہیں مقبولِ خلائق ہونا

(۹)

مسلمانوں کی بے مہری

جب تک کہ نہ ہو دشمنِ اخواں یکّا
ہوتا نہیں مومن کا اب ایماں پکّا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے
سُنتے ہیں کسی کو جب مسلماں یکّا

(۱۰)

مکر و ریا

حالی! رہِ راست جو کہ چلتے ہیں سدا
خطرہ اُنھیں گرگ[2] کا نہ ڈر شیروں کا
لیکن اُن بھیڑیوں سے واجب ہے حذر
بھیڑوں کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما

(۱۱)

عیش و عشرت

اے عیش و طرب تو نے جہاں راج کیا
سلطاں کو گدا غنی کو محتاج کیا
ویراں کیا تو نے نینوا[3] اور بابل[4]
بغداد کو قرطبہ[5] کو تاراج کیا

---

[1] خالص شہد ۱۲ [2] گرگ۔ بھیڑیا ۱۲ [3][4] نینوا اور بابل پرانے اور قدیم شہروں کے نام ہیں جو عراق و شام میں واقع تھے ۱۲ [5] قرطبہ۔ بھی مشہور شہر ہے جو اسپین میں واقع ہے ۱۲

(۱۲)

عفو باوجود قدرتِ انتقام

موسیٰؑ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خدا　　مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے　　جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

(۱۳)

پشیمانی

انجام ہے جو کفر کی طغیانی[۱] کا　　ثمرہ ہے وہی غفلت و نادانی کا
لذت سے ندامتوں کی جانا ہم نے　　دوزخ بھی ہے اک نام پشیمانی کا

(۱۴)

گدائی کی ترغیب

اک مردِ توانا کو جو سائل پایا　　کی میں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ ہے اس کا اُن کی گردن پہ وبال　　دے دے کے جنھوں نے مانگنا سکھلایا

(۱۵)

دہری کا الزام گور پرست پر

اک گور پرست نے یہ دہری سے کہا　　ہوگا نہ شقی کوئی جہاں میں تجھ سا
دہری نے کہا کہ کیا خدا کا منکر　　اُس سے بھی گیا کہ جس کے لاکھوں ہوں خدا

---

[۱] طغیانی - طوفان - زیادتی ۱۲

(۱۶)

وقت کی مساعدت

اے وقت بگاڑ کا ہی سب کے چارہ[۱] — پر تجھ سے بگڑنے کا نہیں ہی یارا[۲]
ہو جائے گر ایک تو ہمارا ساتھی — پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا

(۱۷)

دولت میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہی

ڈر ہی کہ پڑے نہ ہاتھ دل سے دھونا — زردار ذرا سوچ سمجھکر ہونا
جس طرح کہ سونے کی کسوٹی ہی محک[۳] — ہی جوہر انساں کی کسوٹی سونا

(۱۸)

اچھوں کو بُرا سُننے میں بھی مزا آتا ہی

رکھتے نہیں وہ مدح و ثنا کی پروا — جو کر کے بھلا خلق سے سُنتے ہیں بُرا
ان گالیوں کا ہی جن کو چسکا حالی — آتا نہیں اُن کو کچھ دعاؤں میں مزا

ردیف (نون)

(۱۹)

توحید

مٹّی سے ہوا سے آتش و آب سے یاں — کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ اسرار[۴] عیاں
پر تیرے خزانے ہیں ازل سے اب تک — گنجینۂ غیب میں اُسی طرح نہاں

[۱] چارہ - علاج ۱۲ [۲] یارا - بمعنی طاقت ۱۲ [۳] محک - وہ پتھر جس پر سونا پرکھا جاتا ہی - اور کسوٹی - یہاں جانچ کے معنی میں ہی ۱۲ [۴] اَسرار، جمع سِر بمعنی بھید - اس کے پہلے الف کو زبر (فتحہ) سے پڑھنا چاہیئے نہ زیر (کسرہ) سے ۱۲

(۲۰)

صلحِ کُل

ہندو سے لڑیں نہ گبر[1] سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

(۲۱)

امتحان کا وقت

زاہد کہتا تھا جاں ہے دیں پہ قربان
پر آیا جب امتحاں کی زد پہ ایمان
کی عرض کسی نے کیجیے اب کیا ہے صلاح
فرمایا کہ بھائی جان جی ہے تو جہان

(۲۲)

شراب اور جوانی

ہو بادہ کشی پہ نہ جوانو! مفتون
گردن پہ نہ لو عقلِ خدا داد کا خون
خود عہدِ شباب اک جنوں ہے اب تم
کرتے ہو فزوں جنوں پہ اک اور جنون

(۲۳)

طالب کو سوچ سمجھ کر پیر بنانا چاہیئے

ہوں یا نہ ہوں پیر اہلِ عرفاں[2] و یقیں
پر ڈر یہ ہے کہ طالب نہ ہوں ناداں کہیں
گاہک کو ہے احتیاج چار آنکھوں کی
اور ایک کی بھی بیچنے والے کو نہیں

---

[1] گبر۔ آتش پرست۔ پارسی ۱۲ [2] اہلِ عرفان و یقین۔ اہل اللہ۔ بزرگ ۱۲

(۲۴)

انقلابِ روزگار

بس بس کے ہزاروں گھر اُجڑ جاتے ہیں گڑ گڑ کے علم لاکھوں اُکھڑ جاتے ہیں
آج اس کی ہی نوبت تو کل اُس کی باری بن بن کے نہیں کھیل بگڑ جاتے ہیں

(۲۵)

آثارِ زوال

آبا[۱] کو زمین و ملک پر اطمینان اولاد کو سستی پہ قناعت کا گمان
بچے آوارہ اور بے کار جوان ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہمان

(۲۶)

شرطِ قبول

ممکن ہی کہ جوہر کی نہ ہو قدر کہیں پر قدر کہیں بغیر جوہر کے نہیں
عنبر[۲] کو نہ لیں مفت یہ امکاں ہی۔ مگر عنبر کی جگہ نہ لے گا کوئی سرگیں[۳]

(۲۷)

شانِ اِدبار

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان برسات میں سبزے کا نہ تھا جس پہ نشان
مایوس تھے جس کے جوتنے سے دہقان یاد آئی ہمیں قوم کے اِدبار[۴] کی شان

---

[۱] آبا۔ اب کی جمع بمعنی باپ دادا۔ اسلاف ۱۲ [۲] عنبر۔ موم کی طرح ایک خوشبودار چیز ۱۲
[۳] سرگیں۔ گوبر ۱۲ [۴] اِدبار۔ بکسر الف بمعنی تباہی ۱۲

(۲۸)

جوہرِ قابلیت

ہیں بے ہنروں میں قابلیت کے نشاں ——— پوشیدہ ہیں وحشیوں میں اکثر انساں
عاری ہیں لباسِ تربیت سے ورنہ ——— ہیں طوسی[1] و رازی[2] انھیں شکلوں میں نہاں

(۲۹)

عزّت کس چیز میں ہے

دولت نے کہا: مجھ سے ہے عزت ہی جہاں ——— فرمایا ہنر نے، میں ہوں عزت کا نشاں
عزّت بولی، غلط ہے دونوں کا بیاں ——— میں بھید ہوں حق کا جو ہے نیکی میں نہاں

(۳۰)

علم

ہے تجھ سے نہال جیسی مغرب کی زمیں ——— مشرق کو وہ فیض تجھ سے اے علم نہیں
شاید اے علم، ماہِ نخشب[3] کی طرح ——— رہتی ہیں شعاعیں تیری محدود وہیں

(۳۱)

توقّعِ بے جا

ہیں یار رفیق، پر مصیبت میں نہیں ——— ساتھی ہیں عزیز، ایک ذلّت میں نہیں
اُس بات کی انساں سے توقع ہے عبث ——— جو نوعِ بشر کی خود جبلّت[4] میں نہیں

---

[1] و [2] نظام الملک طوسی یا نصیر الدین طوسی اور فخر الدین رازی جو مشاہیر حکما و علما میں گزرے ہیں ۱۲
[3] ماہِ نخشب نخشب ترکستان کے ایک شہر کا نام تھا جہاں ایک حکیم (حکیم مقنّع) نے ایک طلسمی چاند بنایا تھا جو ایک کنوئیں سے نکلتا تھا اور بارہ میل تک اُس کی روشنی پھیلتی تھی ۱۲ [4] جبلّت ۔ فطرت ۔ طبیعت ۱۲

(۳۲)

غیبت

رونق ہی ہراک بزم کی اب غیبت میں
بدگوئیِ خلق ہے ہراک صحبت میں
اوروں کی بُرائی ہی پہ ہے فخر وہاں
خوبی کوئی باقی نہیں جس اُمّت میں

(۳۳)

سختی کا جواب نرمی ہے

فتنے کو جہاں تلک ہو دبنے نہ سکیں
زہر اُگلے کوئی تو کیجے باتیں شیریں
غصہ، غصّے کو اور بھڑکاتا ہے
اس عارضے کا علاج بالمثل[1] نہیں

(۳۴)

محنت

محنت ہی کے پھل ہیں یاں ہراک دامن میں
محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موسیٰ کو ملی نہ قوم کی چوپانی
جب تک نہ چرائیں بکریاں مدین[2] میں

(۳۵)

تکفیرِ اہلِ اسلام

کہنا فقہا کا مومنوں کو بے دیں
سنتے سنتے یہ ہو گیا ہم کو یقیں
مومن سے ضرور ہوگا مرقد میں سوال
تکفیر بھی کی تھی فقہا[3] نے کہ نہیں؟

---

۱ علاج بالمثل۔ اُس علاج کو کہتے ہیں جو اُس چیز سے کیا جائے جس کی وجہ سے مرض پیدا ہوا ۱۲
۲ مدین۔ قدیم شہر مصر و شام کی طرف ۱۲ ۳ فقہا۔ فقیہ کی جمع۔ فقہ کے عالم ۱۲

(۳۶)

دانا کا حال نادانوں میں

کیا فرق؟ سماعت نہ ہو جب کانوں میں — دانائی کی باتوں میں اور افسانوں میں
غربت میں ہے اجنبی مسافر جس طرح — دانا کا یہی حال ہے نادانوں میں

(۳۷)

حسنِ ظن اصل حال نہیں کھلنے دیتا

صوفی کو کسی نے آزمایا ہی نہیں — نیکی میں شک اُس کی کوئی لایا ہی نہیں
ہو سکہ رائج میں بھی شاید کچھ کھوٹ — پر اُس کو کسی نے یاں تپایا ہی نہیں

(۳۸)

انسان کی حقیقت

ممکن ہے کہ ہو جائے فرشتہ انساں — ممکن ہے بدی کا نہ رہے اُس میں نشاں
ممکن تو ہے سب کچھ پہ حقیقت یہ ہے — انسان ہے اب تک وہی قرنُ الشیطاں[۱]

(۳۹)

حد سے زیادہ غصّہ قابلِ عفو ہے

غصّے پہ کسی کے غصّہ آتا ہے وہیں — جب تک کہ رہے وہ عقل و دانش کے قریں
آپے سے جب اپنے ہو گیا تو باہر — پھر کس سے ہوں آزردہ کہ تو تو ہی نہیں

۱؎ قرن بمعنی شاخ۔ سینگ۔ مدعا یہ ہے کہ آدمی شیطان کا سینگ ہے یعنی اس سے وابستہ ہے ۱۲

(۴۰)

اسراف

مُسرف نہ بس اپنے حق میں کانٹے بوئیں
نعمت نہ خدا کی رائگاں یوں کھوئیں
گر بُخل پہ لوگ اُن کے ہنسیں، تو بہتر ہے
اس سے کہ فضولیوں پہ اُن کی رو دئیں

(۴۱)

کھانا بغیر بھوک کے مزا نہیں دیتا

کھانے تو بہت میسّر آئے ہیں ہمیں
جو دیکھ کے چکھ کے دل سے بھائے ہیں ہمیں
پر سب سے لذیذ تھے وہ کھانے اے بھوک
جو تو نے کبھی کبھی کھلائے ہیں ہمیں

(۴۲)

مخالفت کا جواب خاموشی سے بہتر نہیں

حق بول کے اہلِ شر سے اڑنا نہ کہیں
بھڑکے گی مدافعت[۱] سے اور آتشِ کیں[۲]
گر چاہتے ہو کہ چپ رہیں اہلِ خلاف
جُز ترکِ خلاف کوئی تدبیر نہیں

(۴۳)

انسان اپنے عیب اپنے سے بھی چھپاتا ہے

جیسا نظر آتا ہوں، نہ ایسا ہوں میں
اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے
بس مجھ کو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

---

[۱] مدافعت۔ ہٹانا۔ دفع کرنا۔ دُور کرنا ۱۲ [۲] کیں۔ بمعنی کینہ ۱۲

(۴۴)

بڑھاپے میں عاشقی کا دم بھرنا

آہیں پیری میں شیخ بھرتے نہیں یوں — دل دیتے ہیں پر جی سے گزرتے نہیں یوں
تھے تم تو ہر اک قید سے آزاد سدا — جو جیتے ہیں اس طرح وہ مرتے نہیں یوں

ردیف (ی)

(۴۵)

توحید

جب مایوسی دلوں پہ چھا جاتی ہے — دشمن سے بھی نام تیرا جپوا[1] تی ہے
ممکن ہے کہ سکھ میں بھول جائیں اطفال — لیکن انھیں دکھ میں ماں ہی یاد آتی ہے

(۴۶)

توحید

ہستی سے ہی تری رنگ و بو سب کے لیے — طاعت میں ہی تیری آبرو سب کے لیے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور — سب اپنے لیے ہیں اور تو سب کے لیے

(۴۷)

ترکِ شعر عاشقانہ

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی — بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ! تو نے ہم کو چھوڑا[2] — ہم نے بھی تری رام کہانی[3] چھوڑی

---

[1] جپوانا - رٹوانا ۱۲ [3] رام کہانی - افسانہ - گفتگو - خیال ۱۲

(۴۸)

دوستوں سے بے جا توقّع

تا زیست وہ محو نقشِ موہوم[1] رہے
جو طالبِ دوستانِ معصوم رہے
اصحاب سے بات بات پر جو بگڑے
صحبت کی وہ برکتوں سے محروم رہے

(۴۹)

کام کی جلدی

یاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے
آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام اُن کو جلدی بھگتاؤ
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

(۵۰)

علم

اے علم کلیدِ[2] گنجِ شادی تو ہے
سرچشمۂ نعماؤ آبادی[3] تو ہے
آسائشِ دو جہاں ہے سائے میں ترے
دنیا کا وسیلہ دیں کا ہادی تو ہے

(۵۱)

خاندانی عزت

بیٹا نکلے نہ جب تلک ذلت سے
عزت نہیں اُس کو باپ کی عزت سے
سوچو تو ہے کہاں کا نسب بھی عالی
پر اس کو شرف نہیں کچھ اس نسبت سے

---

[1] موہوم - وہمی، خیالی ۱۲ [2] کلید - کنجی -
[3] نعماو ابادی - نعمتیں - قدرتیں ۱۲

(۵۲)

عقل اور دوستی متضاد ہیں

ہے عقل میں جس قدر کمی اور بیشی — اتنی ہی مغائرت[1] ہے یاں اور خویشی
وہ دوست نہیں جس نے کیا فکرِ مآل — ضدین ہے دوستی و دور اندیشی

(۵۳)

عیش و عشرت

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے — ہر قہقہہ پیغامِ بکا[2] ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں — کہتا ہوں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے

(۵۴)

تنزل اہل اسلام

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر[3] کے بعد — دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

(۵۵)

اوّل کوشش بعد دعا

کوشش میں ہے شرط ابتدا انساں سے — پھر چاہیے مانگنی مدد یزداں سے
جب تک کہ نہ کام دست و بازو سے لیا — پائی نہ نجات نوح[4] نے طوفاں سے

---

[1] مغائرت - اجنبیت ۱۲ [2] بکا - رونا - نالہ کرنا ۱۲ [3] مد و جزر - دریا کا چڑھاؤ اتار ۱۲
[4] جب تک حضرت نوحؑ نے کشتی بنانے کے لئے ہاتھ پاؤں نہیں ہلائے طوفان سے نجات حاصل نہ کرسکے ۱۲

(۵۶)

کام کرنا جان کے ساتھ ہی

ہے جان کے ساتھ کام انساں کے لیے بنتی نہیں زندگی ہے بے کام کیے
جیئے ہو تو کچھ۔ کیجیے زندوں کی طرح مُردوں کی طرح جیے تو کیا خاک جیے

(۵۷)

جھوٹی نمائش

ہیں جھوٹ کے سچ میں سب سموٗنے والے[1] بننے والوں سے کم ہیں ہونے والے
گھڑیاں رہتی ہیں جن کی جیبوں میں مدام اکثر ہیں وہی وقت کے کھونے والے

(۵۸)

رفارم کی حد

دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبّا باقی
دھو شوق سے دھبّے کو پہ اتنا نہ رگڑ دھبّا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

(۵۹)

سُفہا کی مدح و ذم

کرتے ہیں سفیہ[2] اگر مذمّت تیری کر شکر کہ ثابت ہوئی عصمت[3] تیری
پر۔ مدح کریں وہ گر۔ نصیبِ اعدا رکھ یاد کہ اچھی نہیں حالت تیری

---

[1] سمونا۔ ٹھنڈی اور گرم چیز کو ملانا ۱۲ [2] سفیہ۔ بمعنی بے وقوف ۱۲ [3] عصمت۔ بمعنی عزت، حرمت ۱۲

(۶۰)

غم رفتگاں

مرنے پہ مرے وہ روز و شب روئیں گے
جب یاد کریں گے مجھے تب روئیں گے
الفت پہ۔ وفا پہ۔ جاں نثاری پہ مری
آگے نہیں روتے تھے تو اب روئیں گے

(۶۱)

ایضاً

فرقت میں بشر کی رات کیوں کر گزرے
اک خستہ جگر[1] کی رات کیوں کر گزرے
گزری نہ ہو جس بغیر یاں ایک گھڑی
یہ چار پہر کی رات کیوں کر گزرے

(۶۲)

دل بہ یار دست بہ کار

یاد اُس کی یہاں ورد[2] مدام اپنا ہے
خالی نہ ہو جو کبھی وہ جام اپنا ہے
کس طرح نہ لیجیے کہ ہے نام اُس کا
کس طرح نہ کیجیے کہ کام اپنا ہے

---

[1] خستہ جگر۔ پریشاں۔ مضطرب درد مند ۱۲ [2] ورد۔ بمعنی وظیفہ۔ جاری ۱۲

بعض قواعد و فوائد

متعلق

عروض، بیان، بدیع

عَروض

عَروض، عین کے زبر (فتحہ) سے اُس فن کا نام ہی جس کے ذریعے سے نثر کے مقابل میں نظم کی صحیح جانچ اور پہچان ہوتی ہی۔ جس طرح کوئی مادّی چیز ترازو اور کانٹے میں تولی جاتی ہی، اسی طرح شعر کی صحیح موزونیت کا معیار فنِ عَروض سے قائم ہو جاتا ہی۔

الفاظ، حرفوں سے بنتے ہیں اور ایک لفظ کم سے کم دو حرفوں کا ہوتا ہی اور زیادہ سے زیادہ آٹھ یا نَو حرفوں کا۔ دو حرفی لفظ کا تلفظ دو طرح ہوتا ہی۔ یعنی پہلا حرف متحرک (جس پر زبر زیر اور پیش ہو) ہوگا۔ جیسے بَل - گُل - رِل یا دونوں حرف متحرک ہوں گے۔ لیکن ایسا لفظ اُردو میں کوئی نہیں جس کے دونوں حرف متحرک ہوں۔ البتہ فارسی و عربی میں دو حرفی الفاظ بحالتِ ترکیب متحرک ہو جاتے ہیں۔ جیسے دلِ من - رُخِ او وغیرہ۔ ایسے دو حرفی الفاظ کو عَروض کی اصطلاح میں سبب کہتے ہیں جس کی جمع اسباب ہی۔

پہلی قسم جس کا پہلا حرف متحرک اور دوسرا ساکن ہی اس کو سببِ خفیف،

اور دوسرے کو سببِ ثقیل کہتے ہیں۔
اسی طرح سہ حرفی الفاظ کی بھی دو شکلیں ہیں۔ یعنی پہلا اور دوسرا حرف متحرک اور آخری حرف ساکن ہوگا۔ جیسے خبر۔ گھر۔ سپر وغیرہ یا پہلا حرف اور آخر کا حرف متحرک اور بیچ کا ساکن۔ مگر اس کی مثال اردو میں نہیں کہ آخر کا حرف متحرک ہو۔
ان سہ حرفی الفاظ کو وتد کہتے ہیں جس کی جمع اوتاد ہے۔
پہلی قسم جس کا پہلا اور دوسرا حرف متحرک ہو اُس کو وتدِ مجموع اور دوسرے کو وتدِ مفروق کہتے ہیں۔ مگر وتدِ مفروق کی یہ تعریف اردو الفاظ کے مطابق نہیں اس لئے اردو کا وتدِ مفروق جس کا نام وتدِ ثانی رکھ لیا جائے یہ ہوگا کہ پہلا حرف متحرک اور باقی دونوں حرف ساکن ہوں جیسے گول۔ گال۔ کیل وغیرہ۔
یہ خصوصیت اردو کے لئے ہے ورنہ فارسی و عربی میں وتدِ مفروق وہ سہ حرفی لفظ مانا گیا ہے جس کا پہلا اور آخر کا حرف متحرک ہو اور بیچ کا ساکن مگر یہ صورت اکثر ترکیب میں واقع ہوتی ہے۔ جیسے ابرِ تر وغیرہ۔
تیسری قسم چار اور پانچ حرفوں والے الفاظ کی ہے جن کو فاصلہ کہتے ہیں۔ اُن میں پہلی قسم یہ ہے کہ تین حرف متحرک اور آخر ساکن اور دوسری قسم یہ ہے کہ چار پہلے حرف متحرک اور آخری پانچواں ساکن ہو۔ ان دونوں قسموں کی مثالیں اردو الفاظ میں معدوم ہیں۔ صرف عربی کے لئے مخصوص ہیں۔ فارسی میں جو مثالیں ملتی ہیں وہ ترکیب کے ساتھ ملتی ہیں۔ پہلی قسم جس کو فاصلۂ صغرےٰ کہتے ہیں۔ "دلِ ما" کی مثال سے ظاہر ہوگی۔ اور دوسری قسم جس کو فاصلۂ کبریٰ کہا جاتا ہے اُس کی مثال "بکفِ غم" سے سمجھ میں آسکے گی۔ ان حرفوں اور

حرکتوں کے اضافے اور ردوبدل سے جو الفاظ مخصوص عَروض میں مروّج ہیں اُن کو ارکان کہتے ہیں اور ان دو حرفی و سہ حرفی و چہار حرفی کو اجزا۔ یعنی سبب، وَتد اور فاصلہ۔ ارکان کے اجزا ہیں۔ ارکان جن سے بحریں بنتی ہیں وہ تعداد میں دس ہیں۔ جن کے عربی نام یہ ہیں:-

فعولن[۱] فاعلن[۲] مستفعلن[۳] مفاعیلن[۴] فاعِلاتن[۵] متفاعلن[۶]

مفاعلتن[۷] - مفعولات[۸] - فاعِ لاتن[۹] - مس تفع لن[۱۰]

یہ دسوں ارکان مستقل ہیں۔ ان میں وزن شعر کی وجہ سے جب تغیر ہوتا ہے تو اُس تغیر کا نام اصطلاح عَروض میں زِحاف (ز کے زیر (کسرہ) سے) ہے جیسے فاعلاتن اصل ہے اُس کو مفعولن کرلیا یا فعولن سے فعولا ن یا فاع لن سے فاع۔ یا فعلن سے فع۔

یہ ارکان ہر شعر میں کم سے کم ۴ مرتبہ اور زیادہ سے زیادہ سولہ[۱۶] مرتبہ آتے ہیں۔ چار[۴] رکنوں کا شعر اُردو میں قریب قریب نہ ہونے کے ہے اور سولہ[۱۶] رکنوں کا شعر بھی بہت کم مستعمل ہے۔ چھہ[۶] یا آٹھ رکن کے اشعار بکثرت مروّج ہیں۔ کبھی ایک ہی رکن کی تکرار پورے شعر میں ہوتی ہے۔ اور کبھی مختلف رکن ہوتے ہیں۔ جیساکہ مثالوں سے معلوم ہوگا۔ ان ارکان کے اجتماع سے ایک وزن بنتا ہے اور ہر وزن کو بحر کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ عربی و فارسی میں کل بحروں کی تعداد اُنیس[۱۹] ہے۔ مگر اُردو میں صرف بارہ[۱۲] بحریں مستعمل ہیں۔ سب بحروں کے نام یہ ہیں:-

مُتقارِب[۱] یا تقارُب - مُتدارِک[۲] - ہزج[۳] - رَجز[۴] - رمل[۵] - کامل[۶]

۸ مضارع - ۹ مقتضب - ۱۰ مجتث - ۱۱ منسرح - ۱۲ سریع - ۱۳ خفیف - ۱۴ وافر - طویل - ۱۵ مدید - ۱۶ بسیط - ۱۷ قریب - ۱۸ جدید - ۱۹ متشاکل -

اکثر بحروں کے تحت میں کئی کئی بحریں پیدا ہوتی ہیں اس اعتبار سے اردو میں تمام مستعملہ بحروں کی تعداد (۳۷) تک پہنچتی ہے۔ رباعی کی بحران سینتیس ۳۷ سے علاوہ ہے۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

ایک شعر دو مصرعوں سے پورا ہوتا ہے۔ اگر ۸ رکن کا شعر ہے تو ۴ رکن ایک مصرع میں ہوں گے اور ۴ دوسرے میں۔ اسی طرح ۶ رکنوں میں، ۳ پہلے مصرع میں اور ۳ دوسرے میں، غرض جتنے ارکان ایک شعر میں ہوں گے اُن کا نصف ایک مصرع میں اور نصف دوسرے میں ہوگا۔ پہلے مصرع کے رکن اول کو **صدر** اور رکن آخر کو **عروض** اور دوسرے مصرع کے رکن اول کو **ابتدا** اور رکن آخر کو **ضرب** کہتے ہیں۔ باقی درمیانی ارکان کو **حشو** کہا جاتا ہے۔

شعر کے ٹکڑے کرکے ارکانِ بحر کے مطابق کرنے کو **تقطیع کرنا** کہتے ہیں یعنی متحرک کے مقابل میں متحرک اور ساکن حرف کے مقابلے میں ساکن اجزا و حروف رکھے جاتے ہیں جس کی مثال یہ ہے ؎

مجھے سیدھیاں وہ سنانے لگا   کجی اُس کی جو میں جتانے لگا

اس شعر کی تقطیع کی جائے تو پہلے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی بحر کیا ہے اور کون سا وزن اس کے مطابق ہے۔ اس بحر کا نام بحر متقارب یا تقارب نمبر (۲) ہے اور اُس کے ارکان یہ ہیں۔ فعولن، فعولن فعولن فَعَل اور یہ ۸ رکن کی بحر ہے۔ ایک مصرع میں ۴۔ دوسرے مصرع میں ۴۔ اب اس کی تقطیع اس طرح کی جائے گی

گجی اُس ۔فعولن ۔ گجو می ۔فعولن ۔جتا نے ۔فعولن ۔ لگا ۔ فعَل ۔

اسی طرح ہر شعر اور ہر مصرع کی تقطیع کی جاتی ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ عروض کا وزن صرف تلفظ کے مطابق ہوتا ہے۔ املا کے موافق نہیں ہوتا جو حرکت یا لفظ بولنے میں آئے وہی لیا جائے گا۔ لکھے ہوئے کا لحاظ نہ ہوگا جس کی تفصیل یہ ہے۔

۱ ۔ عربی کا الف لام جو پڑھنے میں نہ آئے جیسے ع رہنے کو سے جگہ کہ غریب الدیار ہیں
اس میں غریب الدیار کا الف لام تقطیع میں شمار نہ ہوگا۔

۲ ۔ الف وصل ۔یعنی جب الف کے ماقبل حرف ساکن ہو تو وہ الف تقطیع سے گر جائے گا۔ جیسے ع اب آچکا ہے لبوں پر معاملہ دل کا ۔ اس میں آچکا کا پہلا الف تقطیع سے خارج ہے۔

۳ ۔ واو معدولہ ۔ جو پڑھنے میں نہیں آتا ۔ جیسے ع ہجر میں خواب و خور حرام ہوا ۔ اس میں خواب اور خور کا واو ۔ اسی طرح دوبارہ ۔ اور دو چار وغیرہ کا واو ہے۔

۴ ۔ واوِ عطف ۔جس کے پڑھنے میں کھنچاؤ (اشباع) نہ ہو جیسے ۔ ع
زلف و رخ شام و سحر دیکھتے ہیں

۵ ۔ ہائے مخلوط (دو چشمی) جیسے ۔ ع دل میں ہے یاد تمھاری ہر دم ۔ تمھاری کی ھ

۶ ۔ یائے مخلوط ۔جیسے ع آج گیا ہے جو بیمار ہوتا ہے ۔ میں کیا اور بیمار کی ی ۔

۷ ۔ تین حرف ساکن برابر برابر آئیں تو آخر کا حرف تقطیع میں نہیں لیا جاتا جیسے ع مجکو دشمن سے گلے مل کر جو آئی بوئے دوست ۔ میں دوست کی ت ۔

۸ ۔ حرفِ علت ، یعنی الف ۔ واو ۔ ی ۔ جب کہ الفاظ کے آخر میں ہوں اور دب کر

پڑھے جائیں، جیسے ع پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی - میں پہلے اور تھی کی ی
یا ع آیا جب وہ تو مجھے آپ سے جانا ہی پڑا - میں آیا کا دوسرا الف -
تو کا واو - اور ہی کی ی -

۹ - نون غنہ - جیسے ع زمیں جس کی چہارم آسماں ہے - میں زمین اور آسمان کا نون
۱۰ - ہائے مختفی جس کو دبا کر پڑھا جائے جیسے ع پردہ رُخ سے اُٹھا دیا کس نے
میں پردہ کی ہ -

اسی تلفظ کے اعتبار سے بعض موقعوں پر عَروض کے وزن میں ایک حرف زائد
کیا جاتا ہے -

۱ - الفِ ممدودہ کے دو حرف لئے جاتے ہیں جیسے ع دل ٹھکانے ہو تو سوجھے کہیں آنا جانا
میں آنا کے دو الف تقطیع میں لیے جائیں گے -
۲ - حرفِ مشدد میں ایک حرف زیادہ لیا جائے گا جیسے ع وہ وعدے کے سچے وہ پیماں کے پکے
میں سچے کی ج اور پکے کا کاف -
۳ - اضافت، جس کو کھینچ کر پڑھا جائے وہ ایک حرف شمار کی جائے گی جیسے ع
شعلۂ برقِ تجلی نے جلایا طور کو - میں شعلہ اور برق کی اضافت تقطیع کرتے
وقت اس کو شعلے لئے اور برقے لکھیں گے -
۴ - آخر کے واو یا ی پر ہمزہ آنے سے کھچاؤ (اشباع) پیدا ہو تو ایک
حرف زائد لیا جائے گا - جیسے ع لبوں پر نالے آئے جان آئی - "تم کب
آؤ گے" - میں آئے اور آئی کی ی اور آؤ گے کا واو

اس انتخاب میں جتنی بحروں کی غزلیں درج کی گئی ہیں صرف انھیں کی تشریح کی جاتی ہے

اور شناخت کے لئے جو نمبر دیئے گئے ہیں اُن کی وضاحت بھی لکھی جاتی ہے۔

۱۔ بحرِ مضارع۔ اس کے دو وزن اس انتخاب میں موجود ہیں اور وہ دونوں ۸ رُکنی ہیں۔

نمبر (۱) مفعولُ فاع لاتن مفعولُ فاع لاتن (ایک مصرع)

نمبر (۲) مفعولُ فاع لاتُ مفاعیلُ فاع لن (ایک مصرع)

۲۔ بحرِ ہزج۔ اس بحر کے ۶ وزن اردو میں مستعمل ہیں مگر اس انتخاب میں (۵) اوزان ملیں گے جن کی تفصیل یہ ہے:۔

نمبر (۱) مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن (ایک مصرع)

نمبر (۲) مفعولُ مفاعیلن مفعولُ مفاعیلن "

نمبر (۳) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن "

یہ تینوں اوزان ۸ رُکنی ہیں۔ چوتھا وزن بھی ۸ رُکنی ہے جو اس انتخاب میں نہیں اور اس کے ارکان یہ ہیں " مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن (ایک مصرع)

نمبر (۵) مفاعیلن مفاعیلن فعولن (ایک مصرع)

نمبر (۶) مفعولُ مفاعلن فعولن "

پانچواں اور چھٹا وزن ۶ رُکنی ہے۔

۳۔ بحرِ رمل۔ اس کے پانچ وزن اردو میں مستعمل ہیں اور پانچوں بحریں اس انتخاب میں موجود ہیں۔

نمبر (۱) ۸ رُکنی۔ فاعِلاتن فاعِلاتن فاعِلاتن فاعِلن یا فاعلات (ایک مصرع)

نمبر (۲) ۸ رُکنی فاعِلاتن فعِلاتن فعِلاتن فعِلن یا فعِلات یا فعْلن یا فعلات "

ان دونوں صورتوں میں فاعلاتن کی جگہ فعِلاتن بھی آتا ہے۔

نمبر (۳) ۸ رُکنی - فِعلاتُ فاعِلاتن فِعلاتُ فاعِلاتن

نمبر (۴) ۶ رُکنی فاعِلاتن فاعِلاتن فاعلن یا فاعلات

نمبر (۵) ۶ رُکنی فاعِلاتن فِعِلاتن فعِلن یا فعِلات یا فعِلن یا فعِلات

ان ۶ رُکنی بحروں میں بھی فاعلاتن کی جگہ فِعلاتن بھی آتا ہے۔

(۴) بحرِ متقارب، جس کو تقارُب بھی کہتے ہیں۔ اس کے سات وزن اُردو میں مستعمل ہیں۔ مگر اس انتخاب میں صرف (۴) وزن ملیں گے۔

نمبر (۱) ۸ رُکنی فعولن فعولن فعولن فعولن

نمبر (۲) ۸ رُکنی۔ فعولن فعولن فعولن فعول یا فعل

اس بحر کا وزن نمبر (۳) جو اس انتخاب میں نہیں ہے یہ ہے

"فعلن فعولن فعلن فعولن یا فعولان"

نمبر (۴) ۸ رُکنی فعلن فعلن فعلن فاع

اس نمبر میں بہت سے تغیرات ہوتے ہیں۔

نمبر پانچ کی مثال بھی اس انتخاب میں نہیں اور وہ (۱۶) رُکنی ہے جس کے ارکان یہ ہیں :- فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن (ایک مصرع)

نمبر (۶) ۱۶ رُکنی فعولُ فعلن فعولُ فعلن فعولُ فعلن فعولُ فعلن

اس وزن میں بھی بہت سے تغیرات ہوتے ہیں۔

ساتویں نمبر کا وزن بھی اس انتخاب میں نہیں ہے اور اس کا استعمال بھی اُردو میں شاذ و نادر ہے جس کے ارکان یہ ہیں :

" فعلن فعولن فعلن فعولن فعلن فعولن فعلن فعولن (ایک مصرع)

۵ - بحرِ مُتدارک - اس بحر میں بکثرت تغیرات ہوتے ہیں اور چونکہ اس انتخاب میں ایک وزن (نمبر ۷) کے سوا کوئی نمونہ نہیں اس لئے تفصیل فضول سمجھی گئی کتبِ متعلقہ سے معلوم کرنا چاہئے۔ وزن مندرجۂ انتخاب ۱۶ رکن کا ہے اور اس وزن میں بھی بہت ردوبدل ہوتی ہے۔

فعْلن فعْلن فعْلن فعْلن فعْلن فعْلن فعْ یا فاع (ایک مصرع)

۶ - بحرِ مُجتث - اس کا ایک ہی وزن اُردو میں مستعمل ہے جس میں چار طرح تغیر ہوتا ہے یعنی آخر رکن فعِلن کو بکسرۂ عین یا بسکون عین (فعْلن یا فعِلان بکسرۂ عین یا فعْلان بسکون عین) لاتے ہیں اور ان سب کا اجتماع ایک نظم میں جائز ہے۔ ارکان یہ ہیں:

مفاعِلن فعِلاتن مفاعِلن فعِلن (ایک مصرع)

۷ - بحرِ خفیف - یہ ۶ رُکن کی بحر ہے اور اس کے ارکان یہ ہیں:

فاعِلاتن مفاعِلن فعِلن

اس میں فعِلن کی جگہ فعْلن (بسکون عین) اور فعِلان یا فعْلان (بسکون عین) آتا ہے اور فاعِلاتن کی جگہ فعِلاتن بھی جائز ہے

۸ - بحرِ کامل - یہ ۸ رُکنوں کی بحر ہے اور اس کا بھی ایک ہی وزن اُردو میں مستعمل ہے۔ ارکان یہ ہیں:

متَفاعِلن متَفاعِلن متَفاعِلن متَفاعِلن (ایک مصرع)

آخری متفاعلن کی جگہ متفاعلان بھی آتا ہے اور دونوں کی یکجائی ایک شعر میں جائز ہے۔

۹- بحرِ سریع - یہ ۶ رُکنی بحر ہے اور ایک ہی وزن اُردو میں مستعمل ہے جس کے ارکان یہ ہیں :-

مفتعلن مفتعِلن فاعلن

فاعلن کی جگہ فاعلات بھی کہہ سکتے ہیں۔

۱۰- بحرِ رَجَز - یہ ۸ رُکن کی بحر ہے اور ۳ تغیرات کے ساتھ یہ بحر اردو میں مستعمل ہے

نمبر(۱) مُستَفعِلن مستفعِلن مستفعِلن مستفعِلن یا مستفعلان (ایک مصرع میں)

نمبر(۲) مفتعلن مفتعِلن مفتعِلن مفتعِلن

نمبر(۳) مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن

دونوں مفاعلن کی جگہ مفاعلان بھی آتا ہے۔ صرف آخری وزن نمبر(۳) اس انتخاب میں موجود ہے۔

ان دسوں بحروں کے نمونے اس انتخاب میں موجود ہیں۔ باقی دو وزن من جملہ ۱۲ وزنوں کے لطور اطلاع لکھے جاتے ہیں۔ ان کی مثالیں اس انتخاب میں نہ ملیں گی۔

۱۱- بحرِ مُقتَضَب - ۸ رُکن کی بحر ہے اور وزن یہ ہے :

فاعلاتُ مفعولن فاعلاتُ مفعولن

مفعولن کی جگہ مفعولان بھی آتا ہے۔ اس کی مثال مرزا غالب کے شعر سے سمجھ میں آئے گی ؎

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

۱۲ - بحرِ منسرح - یہ بھی ۸ رُکن کی بحر ہے جس کے ارکان یہ ہیں :

مفتعِلن فاعِلن مفتعِلن فاعِلن

فاعلن کی جگہ فاعلات بھی آتا ہے - بطور مثال ناسخ کا شعر لکھا جاتا ہے ؎

قافلۂ بختِ دل اشکوں میں ہے یوں رواں — کرتے ہیں اہلِ فرنگ جیسے سفر آب میں

رباعی

رباعی کی بحر، ہزج سے نکالی گئی ہے جس کو ترانہ بھی کہتے ہیں - اس کا وزن خاص ہے جو ۲۴ بحروں پر مشتمل ہے - ۱۲ وزن مفعول سے شروع ہوتے ہیں اور ۱۲ مفعولن سے - اور یہ سب وزن آپس میں ملے جُلے رہتے ہیں - یعنی رباعی کا ایک مصرع اگر مفعول والے وزن میں ہے اور دوسرا مفعولن والے میں تو یہ اجتماع صحیح اور جائز ہے جب سے رباعی کا ایجاد ہوا ہے اُس وقت سے اب تک اُن شعرا نے، جو واقفِ فن ہیں اسی وزن میں رباعیاں کہی جاتی ہیں - رباعی کے چار مصرع ہوتے ہیں - شاعر کو اختیار ہے کہ چاروں مصرعے ہم قافیہ رکھے یا پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرع کو ہم قافیہ اور تیسرے کو بے قافیہ کہے - اکثر استعمال یہی ہے کہ تیسرا مصرع باقی تینوں مصرعوں سے جدا (بے قافیہ) ہوتا ہے جیسا کہ اس انتخاب کی رباعیوں میں بکثرت موجود ہے - اوزان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) مفعول مفاعیلُ مفاعیلُ فعول	(۲) مفعولن فاعلن مفاعیلُ فعول
مفعول مفاعیل مفاعیل فعُل	مفعولن فاعلن مفاعیلُ فعَل
مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فاع	مفعولن فاعلن مفاعیلن فاع

مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فع
مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فعول
مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فعَل
مفعولُ مفاعلن مفاعیلن فاع
مفعولُ مفاعلن مفاعیلن فع
مفعولُ مفاعیلن مفعولُ فعول
مفعولُ مفاعیلن مفعولُ فعَل
مفعولُ مفاعیلن مفعولن فاع
مفعولُ مفاعیلن مفعولن فع

مفعولن فاعلن مفاعیلن فع
مفعولن مفعولن مفعولن فاع
مفعولن مفعولن مفعولن فع
مفعولن مفعولن مفعولُ فعول
مفعولن مفعولن مفعولُ فعَل
مفعولن مفعولُ مفاعیلُ فعول
مفعولن مفعولُ مفاعیلُ فعَل
مفعولن مفعولُ مفاعیلن فاع
مفعولن مفعولُ مفاعیلن فع

بیان

بیان کے لغوی معنی کسی چیز یا بات کے ظاہر اور واضح کرنے کے ہیں۔ اور اصطلاحِ ادب میں اُس علم کا نام ہے جس میں ایک معنی کو کئی طریقوں سے لکھا جائے، اور اُن طریقوں میں سے کوئی طریق معنیِ مطلوب کے لئے دلیل ہو سکے اور وہ دلالت اپنی حیثیت و حالت کے لحاظ سے واضح ہو یا واضح تر۔ اصطلاحِ بیان میں دلالت کی تین قسمیں ہیں۔ وضعی۔ تضمنی۔ التزامی۔

جو لفظ اُس معنی پر جس کے لئے وہ لفظ وضع کیا گیا ہے پوری طرح دلالت کرے اُس کو وضعی کہتے ہیں۔ جیسے شیر صرف جانورِ مشہور کے لئے کہا جائے۔

اور اگر کسی جزو موضوع لہ پر دلالت کرے وہ تضمنی ہے جیسے بلحاظ نوعیت شیر کو حیوان کہا جائے۔

اور اگر وہ لفظ ایسے معنی پر دلالت کرے جو اصل و حقیقت سے خارج ہو لیکن بلحاظ صفت لازمی ہو اُس کو التزامی کہیں گے۔ جیسے کسی شجاع اور بہادر کو شیر کہا جائے۔

دلالتِ وضعی کو دلالتِ مطابقہ اور تضمنی و التزامی کو دلالتِ عقلیہ کہتے ہیں اور علم بیان میں صرف دلالتِ تضمنی اور التزامی سے بحث ہوتی ہے۔ حقیقی یا وضعی معنی پر علم بیان کا مدار نہیں۔

جو لفظ اپنے اصلی یعنی وضعی معنی کے لئے استعمال کیا جائے اُس کو حقیقت کہتے ہیں اور جس کا استعمال فرضی یعنی غیر حقیقی کے واسطے ہو وہ مجاز کہا جاتا ہے۔ لیکن اس صورت میں حقیقی اور مجازی معنوں میں کوئی نہ کوئی علاقہ ضرور ہوتا ہے وہی علاقہ مجاز کو حقیقت سے ملاتا ہے۔ اسی تعلق کی بنا پر مجاز کی تین قسمیں ہیں۔ ۱ استعارہ ۲ مجازِ مرسل۔ ۳ کنایہ۔

اِستعارہ وہ ہے کہ کسی لفظ کے اصلی یعنی وضعی معنی نہ لئے جائیں بلکہ کسی مشابہت کے ذریعے سے دوسرے تضمنی (شامل کئے ہوئے) معنی لئے جائیں۔ جیسے نرگس کا لفظ آنکھ کے لئے یا سوسن زبان کے لئے بولا جائے۔ نرگس اور سوسن آنکھ اور زبان سے مشابہت رکھتی ہے۔

مجازِ مرسل وہ ہے کہ حقیقی اور مجازی معنوں میں لازم و ملزوم کی طرح کوئی نہ کوئی علاقہ اور نسبت ہو۔ مگر باہم غیر مشابہ ہو۔ جیسے لفظ قارورہ کہ

در اصل اُس ظرف (شیشہ) کو کہتے ہیں جس میں پیشاب رکھا جاتا ہے، لیکن اُسی کو پیشاب بھی کہتے ہیں۔ ان دونوں میں ظرف و مظروف کا علاقہ ظاہر ہے۔ اور غیر مشابہت بھی واضح ہے۔

کِنَایہ۔ پوشیدہ بات کہنے کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں وہ لفظ ہے جس میں مجازی معنی کے ساتھ حقیقی معنی بھی لیے جائیں۔ مثلاً۔ لمبے انگرکھے والا کہکر لمبے قد سے مراد لی جائے۔

مجازی بیان میں استعارہ ہو یا کنایہ سب میں مشابہت کی مطابقت لازمی ہے اس لیے مجاز کی مزید وضاحت کے لئے تشبیہ کی مختصر تشریح ضروری ہے۔

تشبیہ، ایک چیز کو دوسری چیز سے مطابق کرنے کو کہتے ہیں جو کسی وصف کی وساطت سے ملائی جائے۔ جس کو مشابہ کیا جائے اُسے مُشَبَّہ (بفتح با) کہتے ہیں اور جس سے مشابہت دی جائے اُس کو مُشَبَّہ بہ کہیں گے اور جس صفت کو مشابہت کا سبب قرار دیا جائے اُسے وجہ شِبہ (بکسر شین و جزم ب) یا وجہ تشبیہ کہتے ہیں اور جس ذریعے سے مُشَبَّہ اور مُشَبَّہ بہ ملیں اُس کو حرفِ تشبیہ کہا جائے گا۔

اُردو کے حروف تشبیہ۔ سا۔ جیسا۔ اور فارسی کے مانند۔ مثل۔ برابر طرح وغیرہ ہیں۔ مثلاً: زید شیر کی طرح یا مانند ہے۔ تو یہاں زید مشبّہ اور شیر مشبّہ بہ اور طرح یا مانند حرف تشبیہ۔ اور شجاعت و بہادری وجہ تشبیہ ہے۔

استعارہ و تشبیہ کا فرق یہ ہے کہ استعارہ میں صرف مشبّہ بہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور اُس سے مشبّہ مراد ہوتا ہے جیسے کسی حسین کو بغیر نام لئے بلحاظ صفت چاند یا آفتاب وغیرہ کہا جائے۔ بخلاف تشبیہ، کہ اُس میں حسب موقع مشبّہ اور مشبّہ بہ

اور حرف تشبیہ کا ذکر ہوتا ہے۔
تشبیہ اور استعارہ و کنایہ کی بہت سی قسمیں ہیں جن کی تفصیل اس مختصر انتخاب میں نہیں کی جاسکتی۔ صرف اتنی ابتدائی معلومات ان کی حقیقت جاننے کے لیے کافی ہے۔

بدیع

بدیع وہ علم ہے جس سے کلام کی خوبیاں مختلف صنعتوں کے ذریعے سے ظاہر ہوں اور غرض اس کی یہ ہے کہ اُن خوبیوں کی وجہ سے کلام میں زینت اور فصاحت و بلاغت پیدا ہو۔

شعر و شاعری میں صنائع بدائع بکثرت ہیں، سب کی تصریح طوالت سے خالی نہیں۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ معمولی اور ابتدائی باتیں ذہن نشین کر دی جائیں جن سے شاعرانہ صنعتوں کا معیار اور انداز معلوم ہو سکے اس لئے سرسری طریقے سے دو چار مشہور صنعتوں کا مذکور کیا جاتا ہے۔

تضاد۔ اس صنعت کا نام طباق بھی ہے۔ تعریف یہ ہے کہ دو لفظ ایک دوسرے کی ضد جمع کیے جائیں۔ خواہ وہ دونوں اسم ہوں یا فعل یا حرف جیسے ع

پیری کے ولولے ہیں خزاں کی بہار ہے

اس مصرع میں خزاں اور بہار ایک دوسری کی ضد ہیں یا جیسے ؎

روز مرتا ہوں روز جیتا ہوں ؎ زندگی کا کوئی حساب نہیں

یہاں مرنا جینا متضاد ہیں۔ یا مثلاً: ع خاموش ہیں وہ لب پہ نہ ہاں ہے نہ نہیں ہے

یہاں ہاں اور نہیں باہم مخالف ہیں۔

مراعات النظیر۔ اس صنعت کو توافق اور تناسب بھی کہتے ہیں۔ اس میں ایسے الفاظ جمع کئے جاتے ہیں جو آپس میں مناسبت رکھتے ہوں۔ جیسے ؎

تیرا ہاتی ہے فلک کا ہکشاں ہے خرطوم ؛ کان دونوں مہ و خور، دُم ہے ذَنَب سر ہے راس

ذَنَب کے معنی دم کے بھی ہیں اور ذَنَب و راس ایک شکلِ آسمانی کو بھی کہتے ہیں جو سانپ کی صورت ہے۔

ایہام۔ لغوی معنی وہم میں ڈالنا اور اصطلاح شعر میں اُس صنعت کو کہتے ہیں کہ ایک ایسا لفظ استعمال کیا جائے جس کے دو معنی ہوں اور اُس سے وہ معنی لئے جائیں جو بعید ہوں۔ اس کی دو قسمیں ہیں، ایک ایہام تضاد اور دوم ایہام تناسب۔ مثلاً: ؎

دل جو بھر آیا تو اک شور مچایا میں نے ؛ سارے تالاب کے سوتوں کو جگایا میں نے

یہاں سوتوں کا لفظ ایہام واقع ہوا ہے۔ ایک وہ چھپا ہوا منفذ (سوراخ) جس سے پانی آتا ہے۔ دوم خفتہ (سویا ہوا) شعر کے دوسرے الفاظ مثل تالاب وغیرہ کی مناسبت سے سوراخ کے معنی موزوں معلوم ہوتے ہیں مگر شاعر نے یہاں نیند سے مراد لی ہے۔ اور یہ معنی بعید ہوئے اسی کو ایہام تضاد کہتے ہیں اور ؎

نہ چھوڑے گی جیتا مجھے چشم قاتل ؛ یقیں ہے یقیں بلکہ عین الیقیں ہے

اس شعر میں چشم اور عین ہم معنی ہیں۔ اور عین الیقین کے معنی پختہ یقین کے ہیں جو مقصود اصلی ہے۔ اسی مناسبت لفظی کی وجہ سے اس کو ایہام تناسب کہتے ہیں۔

لف و نشر۔ لف لپیٹنے کے معنی میں ہے اور نشر پھیلانے کے معنی ہیں۔

اصطلاح شعر میں اس کلام کو کہتے ہیں جس میں پہلے چند چیزیں [illegible] جائیں اور پھر اُن کی مناسبت اور تعلقات کے لحاظ سے اُن کی صفات یا تشریح کی جائے اس صنعت کی دو قسمیں ہیں ایک مُرتّب، دوسری غیر مُرتّب۔ مُرتّب کی تعریف یہ ہے کہ جس ترتیب سے پہلے الفاظ کہے جائیں اُسی ترتیب سے دوسرے لکھے جائیں

مثلاً: ؎

نہ ہمّت، نہ دل ہے، نہ قسمت نہ آنکھیں
نہ ڈھونڈھا نہ سمجھا نہ پایا نہ دیکھا

پہلے مصرع میں ہمت اور دوسرے مصرع میں ڈھونڈھنا باہم متناسب ہے اسی طرح دل کے ساتھ سمجھنا اور قسمت کے ساتھ پانا اور آنکھوں کے ساتھ دیکھنا موزونیت رکھتا ہے۔

غیر مُرتّب کی تعریف یہ ہے کہ پہلے اور دوسرے الفاظ کی ترتیب آگے پیچھے ہو جائے۔ جیسے ؎

گُل و نرگس نے باغ میں ہم کو ؛ جلوۂ چشم و رُخ دکھائے ہیں

پہلے مصرع میں گُل ہے اور دوسرے مصرع میں پہلے چشم ہے جو باہم مناسبت نہیں رکھتے اسی طرح نرگس و رُخ۔ یعنی اگر یہ مُرتّب ہوتا تو دوسرے مصرع میں چشم کی جگہ رُخ یا پہلے مصرع میں گُل سے پہلے نرگس کو موزوں کیا جاتا۔